ماھنامہ

حکمت بالغہ

مارچ2007

مدیر:انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن اکیڈمی

جھنگ پاکستان

فون اور فیکس:0092-47-7628361

ای میل:hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ www.hamditabligh.net پر حکمت بالغہ کے تمام شمارے دستیاب ہیں

حرف آرزو

علم ۔۔۔۔اور معلم کا رشتہ ایک لازوال رشتہ ہے اس لئے کہ سیکھنے کے بغیر ’’علم‘‘ نہیں اور سکھانے والے کے بغیر سیکھنے کا تصور نہیں۔ لہٰذا علم ۔۔اور معلم (علم سکھانے والے) کا رشتہ مقدس اور لازوال ہے۔ قرآن مجید میں انبیاءؑ کی بالعموم اور حضرت محمد ﷺ کی بالخصوص شان ’’یتلو علیھم آیتہ‘‘ بیان ہوئی ہے اور فرمان نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کہا گیا ہے۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

’’بیشک میں تو صرف معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں‘‘۔

گویا اصل علم تو ایسی اعلیٰ وارفع شئے ہے اور اس کے حصول کی سعی اتنی اہم اور وقیع ہے کہ اس کے لئے خالق ارض وسماء نے پیغمبر بھیجے جو نہایت پاکیزہ شخصیت و کردار کے مالک تھے اور انہی کی تعلیمات سے ہی علم کے اصلی اور حقیقی سرچشمے پھوٹے ہیں۔

قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا واقعہ سات مرتبہ آیا ہے اور اس واقعہ سے متعلق دیگر اہم قرائن اور جزئیات کا ذکر بھی موقع کی مناسبت سے ہوا ہے۔ چنانچہ مسجود ملائک ہونے کی تاجپوشی کا موقع ہو یا اپنی اہلیہ حضرت حوا سلام علیہا کے ساتھ ’’جنت‘‘ میں خانہ آبادی کا، شیطان کے ورغلانے میں آکر خطا کر بیٹھنے کا یا خطا سے توبہ کر کے اجتبائیت کی بلندی کو چھو لینے کا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑے اہتمام سے اور بڑے لطیف پیرائے میں عظمت انسانی کے ان انمٹ نقوش کی طرف اشارے کئے ہیں جو ہمارے قلب میں پہلے سے ہی موجود ہیں۔ چنانچہ اسی تناظر میں جب

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا سلام علیہا کو دنیا میں بھیجے جانے کا تذکرہ آیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے بطور خاص ایک ایسے علم کا ذکر فرمایا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی شایان شان بھی تھا اور انسان کی اعلیٰ فطرت اور بلند خلقت کا تقاضا بھی یعنی! علم بالوحی اس اعلیٰ ترین علم کا مہبط Recepient صرف حضرت آدمؑ ہی کو نہیں بلکہ اولاد آدم میں سے ایک ناگزیر تعداد میں اعلیٰ ترین قوائے فطرت کے حامل افراد کو بھی بنایا گیا جن کے ذریعے یہ علم دیگر انسانوں تک بھی پھیلا دیا گیا علم بالوحی (Revealed Knowledge) کے حامل ان عظیم اور مقدس ہستیوں کو فارسی میں پیغمبر، عربی میں نبی اور رسول، انگریزی میں Massenger, Prophet اور ہندی میں اوتار کہا جاتا ہے۔

اس ذریعہ علم کا اثبات ایک بدیہی، تاریخی حقیقت ہے اور تاریخ انسانی میں کوئی دور ایسا نہیں ہے جس میں نسل انسانی کی غالب اکثریت نے اس کو تسلیم نہ کیا ہو۔ اس ذریعہ علم کے ثبوت کے طور پر یہ بات بھی تاریخ انسانی کا حصہ ہے اور متفق علیہ ہے کہ اس علم کے لانے والے ذاتی زندگی میں انسانی عظمت و کردار کی اعلیٰ ترین بلندیوں پر تھے اور حسن کردار اور حسن معاشرت میں کوئی کوتاہی تو درکنار کوئی بھول اور غلطی کا شائبہ بھی ان کی طرف منسوب نہیں ہے۔

علم بالوحی (Revealed Knowledge) کی قطعیت اور اس کے لانے والے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اعلیٰ کردار کے بارے میں تاریخ انسانی جس انداز میں متفق ہے وہ ہر صاحب علم جانتا ہے اسی طرح یہ بات بھی اتنی ہی بڑی حقیقت ہے کہ اس علم اور اس کے ریکارڈ کو بعض شریر اور بدکردار لوگوں نے پوری قوت کے ساتھ ضائع کرنے اور اس کے قرائن و آثار تک کو محو کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ یہی وہ خیر اور شر کی جنگ ہے جو ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور دنیا کے خمیر کا حصہ ہے لہٰذا جب تک انسان رہے گا یہ جنگ بھی جاری رہے گی۔ اس باہمی جنگ کا نتیجہ ہے کہ تورات اور انجیل جیسی مقدس کتابوں کے اصلی نسخے دنیا سے ناپید ہو گئے۔

چنانچہ دنیا میں مذاہب کی تاریخ گواہ ہے کہ ان بانیان مذاہب اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کو مسخ کر دیا گیا۔ علم بالوحی کو چھپا دیا گیا اور لوگوں کو ''روایات اور خرافات'' اور خود تصنیف کردہ کتابوں کے پیچھے لگا دیا گیا سوائے ایک استثناء کے اور وہ حضرت محمد ﷺ اور ان کی لائی ہوئی کتاب قرآن مجید ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اور اللہ تعالیٰ نے سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کو تحفظ کیوں نہ دیا اور صرف قرآن مجید ۔۔۔ آخری وحی کو قیامت تک کے لئے محفوظ کرنے کی کیا حکمت ہے؟ یہ ایک غور طلب سوال ہے۔

اس حکمت کا ایک گوشہ جو ظاہر و باہر ہے وہ یہ ہے کہ سب انبیاء علیہم السلام نے جس بڑے نبی کی خبر دی تھی اور جو آخری پیغمبر تھے وہ حضرت محمد ﷺ تھے۔ آپ پر ''وحی'' کا باب صرف ختم ہی نہیں ہوا بلکہ اپنی تکمیلی شان تک پہنچ کر ختم ہوا ہے۔ اور اب یہ مکمل اور حتمی ہدایت (Complete and final guidance) تا قیامت محفوظ کردی گئی ہے۔ اس ''وحی'' یعنی قرآن کی تعلیم اس قرآن کے لانے والے حضرت محمد ﷺ نے ہی دی ہے جس کو احادیث کی کتابوں میں چھان پھٹک کے بعد محفوظ کر دیا گیا ہے اور اسی کی روشنی میں ہی قرآن مجید کی تعلیمات کو سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے۔

علم کی ایک دوسری قسم ہے جو کہ بالکل بدیہی اور عیاں ہے وہ ۔۔۔ علم بالحواس یا تجرباتی علم کہلاتا ہے۔ یہ علم انسان کو بحیثیت انسان عطا ہوا ہے اور تجربے سے نسلاً بعد نسلٍ پروان چڑھ رہا ہے۔ اس علم میں تجربہ اور محنت شرط ہے مسلم یا غیر مسلم اور Believer اور Non Believer کا کوئی مسئلہ نہیں ہے کبھی مسلمان اس علم میں اقوام عالم کی رہنمائی اور قیادت کر رہے تھے اور آج مغرب اور امریکہ اس رہنمائی کے منصب پر فائز ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علم بالحواس اور علم بالوحی دونوں یک جا ہوں اور اکٹھے پڑھائے

جائیں تو ہی انسانی فکر وعمل کی ترقی کا عمل متوازن ہوسکتا ہے۔ وگرنہ یک طرفہ سوچ اور اذہان بنتے ہیں اور نامکمل شخصیات وجود میں آتی ہیں اور انسانی نشو ونما روبہ ترقی ہونے کی بجائے روبہ زوال ہو جاتی ہے۔ اس تجرباتی علم اور وحی کے علم کا ملاپ اور CO-EDUCATION ہی سے متوازن ترقی کا تسلسل برقرار رہ سکتا ہے۔ آج مغرب اپنی بے پناہ مادی ترقی کے باوجود علم بالوحی سے عاری اور تہی دست ہونے کے سبب اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے اور شاید غیر ترقی یافتہ معاشروں سے بھی زیادہ غیر انسانی معاشرہ بن گیا ہے اس کی وجہ یہی علوم انبیاء کو نظرانداز کر دینا ہے۔

علامہ اقبال نے فرمایا! ؎

مشو ایمن ازاں علمے کہ خوانی

کہ از وے روحِ قومے را تواں کشت

خبردار! وہ علم جو آج (کالجوں اور یونیورسٹیوں میں) پڑھایا جا رہا ہے اس سے تمہارا ملی تشخص مردہ ہوکر رہ جائے گا۔ چنانچہ علامہ اقبال نے دورِ حاضر میں مغربی طرزِ تعلیم کے بے خدا ہونے کا اعلان کیا اور اس کے زہر آلودہ اثرات سے بچنے کیلئے کام بھی کیا اور اپنی شاعری سے مسلمانوں کو بروقت خبردار کیا۔ مگر افسوس کہ آج پون صدی بعد بھی تا حال اس بات کی عملی شکل سامنے نہیں آئی کہ پاکستان کا نظامِ تعلیم مسلمان کیا جاسکے۔

اسلام کا نظامِ تعلیم صرف یہ نہیں ہے کہ سکول اور کالج کا نصاب مغربی مفکرین کے مشوروں سے بنا کر اور صرف اس میں اسلامیات کے لیے صبح دعا یا ZERO PERIOD لگا کر (چاہے اس میں طلباء حاضر ہوں یا نہ ہوں) اپنے آپ کو مطمئن کر لیا جائے۔ بلکہ ہمارے نصابِ تعلیم میں چاہے وہ سوشل سائنسز ہوں یا میڈیکل اور انجینئرنگ گروپ سب میں اللہ کی عظمت، آخرت کی جوابدہی کا احساس اور اخلاقی قدروں کا تصور، تانے بانے میں بنا ہوا ہونا چاہئے تاکہ اس نصابِ تعلیم سے نکل کر جب طالب علم عملی زندگی میں جائے تو چاہے ڈاکٹر ہو یا انجینئر، MBA کرے یا کاروبار، زمیندار بنے یا تاجر، ذاتی کاروبار کرے یا سرکاری ملازمت، اس کے ذہن میں اسلامی اور ملی کے ساتھ بنیادی انسانی اخلاقی تصورات پتھر کی لکیر کی طرح نقش

ہونے چاہئیں۔

اگرچہ آج بھی ہمارے نصاب تعلیم کے بارے میں ہمارا وفاقی سطح پر تعلیمی ہدف یہی ہے۔

DAWN LAHORE, SUNDAY, MAY 14,2006 PAGE 25

OBJECTIVES OF HIGHER EDUCATION

(As outlined in the National Education policy)

1. To inculcate islamic ideology, moral values and preservation of our religious and cultural heritage.
2. To equip individuals with the latest knowledge and technology.
3. To provide sufficient base of scientific knowledge and develop capabilities of individuals so that they are able to play their role effectively in society.
4. To Promote intellectual faculties and develop capabilities of individuals so that they are able to play their role effectively in society.
5. To produce highly educated and technically skilled manpower in sufficient number as required by society.
6. To increase access to higher education by providing places and to advance learning and generate knowledge.

تاہم یہ بات عیاں ہے کہ ہمارے نظام سے فارغ التحصیل طلباء اس ہدف پر پورے نہیں اترتے بلکہ اکثر و بیشتر اس سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ناپسندیدہ کردار کے حامل ہوتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ نظام تعلیم کے حوالے سے پالیسی بناتے وقت ہمارے

پالیسی ساز افراد اور اداروں کو پاکستان، پاکستان کی نظریاتی اساس، علامہ اقبال اور قائداعظم کے افکار کو سامنے رکھنا چاہئے تا کہ پاکستان کے مسلمانوں کی آئندہ نسلیں پاکستان کا نظریاتی تحفظ کر سکیں۔ اب تک جو کام نہیں ہوسکا ضروری اور لازم نہیں ہے کہ آئندہ بھی نہ کرنے کا عزم کیا جائے بلکہ غلطی تسلیم کر کے اس کو صحیح کرنے کی پالیسی اپنانا وقت کی پکار ہے۔

2007ء کا سال مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کے سال پیدائش (1207ء) کی مناسبت سے عالمی سطح پر منایا جارہا ہے۔

مولانا رومیؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ان کے دو اشعار ٹائیٹل کے صفحات میں دے دیئے گئے ہیں۔ ان اشعار میں بھی علم بالوحی کو ایک علیحدہ حقیقت باور کرانے پر زور دیا گیا ہے اگرچہ آج کا مغرب انسان کو ایک VALUE LESS کلچر دے رہا ہے اور IMMORAL SOCIETY کا تصور ذہن نشین کرا رہا ہے مگر ایسی فکری گراوٹ نہ پہلے کبھی دیر پا ثابت ہوئی ہے اور نہ اب ہو گی۔ جلد یا بدیر انسانیت دوبارہ حیوانیت سے انسانیت کی طرف مراجعت کرے گی اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور بالخصوص حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کے دامن عاطفت میں پناہ لینے پر مجبور ہو گی اور یہ سب کچھ انسان کی داخلی اور اندرونی سرشت اور فطرت کے تقاضے کے طور پر ہو گا۔ بالکل اسی طرح جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اندر سے ابھرتا ہے اور انسان اس کے لئے محنت و کوشش کرنے لگتا ہے۔

....

تاریخ گواہ ہے کہ 8ھ میں نبی اکرم ﷺ نے جب بادشاہوں کو دعوتی خطوط لکھے اور ان کے درباروں تک پہنچائے گئے تو انجیل کی پیش گوئیاں قیصر روم کی زبان پر آ گئیں اور حضرت ابوسفیانؓ (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور قیصر کے دربار میں حاضر تھے) کی روایت میں ہے کہ قیصر روم نے کہا۔

''میں منتظر تھا کہ نبی آخرالزماں تشریف لانے والے ہیں مگر میں یہ نہیں
سمجھتا تھا کہ وہ عرب کے ریگ زاروں میں آئیں گے بلکہ میں سمجھتا تھا کہ

وہ یورپ میں آئیں گے۔''

غیر یورپی نبی علیہ السلام کی غیر یورپی ہدایت کو قیصر روم نے خودساختہ پیمانوں سے موازنہ کر کے ردّ کر دیا اور یورپ اور مغرب کو 1000 سال کیلئے اندھیرے (DARK AGES) میں دھکیل دیا۔ اگر وہ اس وقت سلطنت کو اہمیت نہ دیتا اور جیسے بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اس نے کہا کہ ''میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مدینہ جا کر اس نبی ﷺ کے پاؤں دھوؤں''۔ سلطنت اور امور سلطنت آڑے نہ آنے دیتا۔۔۔ اسلام لے آتا تو مسلم سپین کی طرح مسلم یورپ بھی اس وقت بامِ عروج پر ہوتا بلکہ شاید دمشق اور بغداد کی جگہ روم آج تک اسلام کا گہوارہ ہوتا۔

تاہم جو وقت گزر گیا ہے وہ گیا۔ آج بھی یورپ ہماری بات نہ مانے مگر مولانا جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ تو یورپی ہیں (روم یورپ میں ہے بلکہ قیصر روم کا شہر اور ویٹی کن کا محافظ ہے) مولانا رومی ہی کی باتوں کو اہمیت دیں اور اس کی بات مان لیں اور تجرباتی علوم کے ساتھ آسمانی ہدایت اور آخری وحی قرآن مجید کو سینے سے لگا لیں تو قرآن مجید سے یہ وابستگی مغرب کو وہ کھویا ہوا سکون واپس دلا سکتی ہے جو آج تمام تر سہولیات کے باوجود مغرب اور یورپ کے انسان کو میسر نہیں ہے۔

کاش 2007ء کا سال مغرب کی اخلاقی بیداری اور آسمانی ہدایت (اور وحی) کی طرف مراجعت کا سال بن جائے۔

ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

سورۃ القمر (54)   اعوذ باللہ من الشیطٰن الرحیم (آیات 23-40)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

كَذَّ بَت ثَمُودُ بِا لنُّذُرِ ☆

شمود نے بھی ہدایت کرنے والوں کو جھٹلایا

فَقَالُوا اَبَشَرَ ا مِّنَّا وَاحِدَ ا نَّتَّبِعُهُ اِنَّا اِذَ الَّفِی ضَلٰلِ وَّسُعُرِ ☆

اور کہا کہ بھلا ایک آدمی جو ہم ہی میں سے ہے ہم اس کی پیروی کریں؟

یوں ہو تو ہم گمراہی اور دیوانگی میں پڑ گئے

ءَ اُلقِیَ الذِّکرُ عَلَیهِ مِن بَینِنَا بَل هُوَكَذَّابُ اَشِرُ ☆

کیا ہم سب میں سے اسی پر وحی نازل ہوئی ہے؟

(نہیں) بلکہ یہ جھوٹا خود پسند ہے

سَیَعلَمُونَ غَدَ ا مَّنِ الكَذَّابُ الاَشِرُ ☆

ان کو کل ہی معلوم ہو جائے گا کہ کون جھوٹا خود پسند ہے

اِنَّا مُر سِلُو ا النَّاقَةِ فِتنَةَ لَّهُم فَارتَقِبهُم وَاصطَبِر ☆

(اے صالح) ہم ان کی آزمائش کیلئے اونٹنی بھیجنے والے ہیں

تو تم ان کو دیکھتے رہو اور صبر کرو

وَنَبِّئهُم اَنَّ المَآءَ قِسمَةُ بَینَهُم كُلُّ شِربِ مُّحتَضَرُ ☆

اور ان کو آگاہ کردو کہ ان میں پانی کی باری مقرر کر دی گئی ہے

ہر (باری والے کو اپنی) باری پر آنا چاہیئے

فَنَدَوا صَاحِبهُم فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ ☆

تو ان لوگوں نے اپنے رفیق کو بلایا اور اس نے (اونٹنی کو) پکڑ کر

اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں

فَكَیفَ كَانَ عَذَا بِی وَنُذُرِ ☆

سو (دیکھ لو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا

اِنّا اَرسَلنَا عَلَیھِم صَیحَۃَ وَّاحِدَۃَ فَکَانُوا کَھَشِیمِ المُحتَظِرِ☆

ہم نے ان پر (عذاب کے لئے) ایک چیخ بھیجی تو وہ ایسے ہو گئے

جیسے باڑ والے کی سُوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ

وَلَقَد یَسَّرنَاالقُراٰنَ لِلذِّکرِفَھَل مِن مُّدَّکِرِ☆

اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟

کَذَّبَت قَومُ لُوطِ بِالنُّذُرِ☆

لُوط کی قوم نے بھی ڈرسنانے والوں کو جھٹلایا تھا

اِنَّآ اَرسَلنَا عَلَیھِم حَاصِباَ اِلَّآ اٰلَ لُوطِ نَجَّینٰھُم بِسَحَرِ☆

تو ہم نے ان پر کنکر بھری ہوا چلائی مگر لوط کے گھر والے کہ ہم نے

ان کو پچھلی رات ہی سے بچا لیا

نِّعمَۃَ مِّن عِندِ نَا کَذٰلِكَ نَجزِی مَن شَکَرَ☆

اپنے فضل سے شکر کرنے والے کو ہم ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں

وَلَقَد اَنذَرَھُم بَطشَتَنَا فَتَمَا رَوابِا لنُّذُرِ☆

اور (لُوط نے) اُن کو ہماری پکڑ سے ڈرا بھی دیا تھا مگر انہوں نے ڈرانے میں شک کیا

وَلَقَدرَا وَدُوہُ عَن ضَیفِہٖ فَطَمَسنَآ اَعیُنَھُم فَذُو قُوا عَذَبِی وَنُذُرِ☆

اور ان سے اُن کے مہمانوں کو لے لینا چاہا۔ تو ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں

سو (اب) میرے عذاب اور ڈرانے کے مزے چکھو

وَلَقَد صَبَّحَھُم بُکرَۃَ عَذَابُ مُّستَقِرُّ☆

اور ان پر صبح سویرے ہی اٹل عذاب آ نازل ہوا

فَذُو قُوا عَذَابِی وَنُذُرِ☆

تو اب میرے عذاب اور ڈرانے کے مزے چکھو

وَلَقَد یَسَّرنَاالقُراٰنَ لِلذِّکرِفَھَل مِن مُّدَّکِرِ☆

اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کیلیئے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟

حکمت رومیؒ

مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ

(ولادت 1207ء)۔(وفات 1273ء)

آج کی علمی دنیا میں سال 2007ء کو مفکر اسلام صوفی حکیم حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ان کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے مختص کر کے منایا جارہا ہے حکمت بالغہ کے صفحات بھی اس مرد جلیل کے ذکر سے محروم رہ جائیں تو بدنصیبی ہوگی مولانا رومیؒ کی مثنوی کو ''ھست قرآن درزبان پہلوی'' سے تعبیر کیا گیا ہے آج کے اخلاق باختہ (Moral Less Souicty) اور بے خدا تعلیم (God Less Educator) کے تناظر میں مولانا رومی کے دو اشعار ہدیہ قارئین ہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور حواس کے ساتھ تعقل اور تفکر بھی عطا فرمایا ہے اور ایک اخلاقی حس (Moral Law) بھی ضمیر کی شکل میں دیا ہے مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اس اخلاقی حس کا حاصل وہ راستہ ہے جو انبیاء علیہم السلام انسانوں کو بتا کر گئے تھے۔ جسے وحی اور (Revealed Know Ledge) کہا جاتا ہے افسوس کہ دنیا ابھی خوفناک نتائج سے بے فکر تعیّشات اور آسائشوں کے حصول میں مگن ہے وگرنہ باطن وظاہر، اخلاق (Moralaty) اور انسانی جسم کے تقاضے نیز (Reality & Appearance) کو کبھی جدا نہیں کیا جاسکتا۔ جب بھی انسان شعوری طور پر بیدار ہو کر اپنی حقیقت کو پالے گا تو وہ یقیناً دور حاضر کے بے خدا فلسفہ اور بے خدا سائنس کو رد کر دے گا انبیاءؑ کے علوم اور وحی کی طرف سفر شروع کر کے قرآن مجید کے دامن میں پناہ لے گا اور حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کو سینے سے لگانے ہی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھے گا۔ (ادارہ)

قرب الٰہی کے دو راستے

مولانا محمد منظور نعمانیؒ ☆

اہل ایمان کے لئے تقرب الی اللہ اور دینی وروحانی ترقی کے دو طریقے اور دو راستے ہیں۔ جو ہمیشہ سے کھلے ہوئے ہیں اور بندگان خدا ہر زمانہ میں کم وبیش ان ہی پر چل کر منزل مقصود تک پہنچتے رہے ہیں۔

ایک طریقہ تو یہ ہے آدمی اپنی ہی اصلاح وترقی اور اپنے ہی نفس کے تزکیہ وتحلیہ میں زیادہ سے زیادہ ساعی رہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ فرائض وواجبات کی ادائیگی اور معصیات و مکروہات سے اپنے نفس کی حفاظت کا بیش از بیش اہتمام کرتے ہوئے جس قدر بھی ممکن ہو نفلی عبادات وقربات روزہ ونماز اور ذکر وفکر وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ مشغول رہے۔ بعض ائمہ محققین کی اصطلاح کے مطابق اس طریقہ کو ''قرب بالنوافل'' کہا جاسکتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فرائض وواجبات کی ادائیگی اور معصیات ومکروہات سے پرہیز گاری کا اہتمام کرتے ہوئے اور اوقات میں گنجائش کے مطابق نفلی عبادات وقربات اور ذکر وفکر میں بھی خاص اشغال رکھتے ہوئے اپنا زیادہ وقت اخلاص نیت کے ساتھ (یعنی محض رضاء الٰہی اور اجر اخروی کو مطمح نظر بنا کر) دوسرے بندگان خدا کی اصلاح وہدایت، تعلیم وتربیت اور تبلیغ ونصیحت جیسے کاموں میں اور اعلاء کلمۃ الحق واحیاء شریعت کی کوششوں میں صرف کیا جائے۔

اس طریقہ کو ''قرب بالفرائض'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور اگر چہ اسلام کے قرون اولیٰ

☆ (ماخوذ ماہنامہ میثاق لاہور)

میں سالکین رضا اور طالبین قرب مولی کے لئے یہی عام شاہراہ تھی۔ لیکن بعد کے زمانوں میں خاص اسباب کی وجہ سے اس راہ پر چلنے والوں کی کثرت نہیں رہی بلکہ معاملہ معکوس ہوگیا۔ یعنی اہل سلوک کے مختلف حلقوں میں زیادہ تر پہلے ہی طریقہ کو اختیار کیا گیا اور اس سے بھی بڑا اور افسوسناک ذہنی تغیر یہ ہوا کہ بہت سے خانقاہی دائروں میں سلوک الی اللہ اور تقرب خداوندی کو صرف اسی پہلے طریقہ (قرب بالنوافل) ہی میں منحصر بھی سمجھا جانے لگا۔ اور ان لوگوں کے خیال میں روحانی و دینی کمال صرف قرب بالنوافل ہی کا نام رہ گیا۔

مختلف زمانوں میں مصلحین و مجددین نے اس غلط خیالی کو محسوس کر کے اس کی اصلاح کی کوششیں بھی کیں لیکن پھر بھی بہت سے خاص و عام حلقوں میں یہ غلط فہمی اب تک چلی آ رہی ہے (۱) جس کا افسوسناک اور نہایت مضرت رساں نتیجہ یہ ہے کہ امت کی عمومی تعلیم و تربیت، اصلاح و دعوت اور اقامت دین و احیاء شریعت کا وہ اہم بنیادی کام جو دینی نظام کے لئے گویا ریڑھ کی ہڈی ہے اور دین کی سرسبزی و شادابی جس پر موقوف ہے اور بلا شبہ جس کا اجر اور درجہ بھی اللہ کے نزدیک صرف نفلی عبادات و قربات اور ذکر و فکر میں مشغول رہنے سے بہت زیادہ ہے۔ آج ان عام و خاص حلقوں میں وہ ایک عمومی قسم کا اور معمولی درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے اور دینی و روحانی ترقی کے طالب اور قرب خداوندی کے جویا اپنے اس سفر میں اور اس مقصد کے لئے اس راہ سے چلنے اور اپنے اوقات اور اپنی ہمتوں کو اس رخ پر لگانے کا ارادہ بھی نہیں کرتے جس کی وجہ سے یہ میدان اصحاب ہمت و عزیمت سے خالی اور یہ بازار سرد پڑا ہوا ہے حالانکہ ''شہسواروں'' کی تگ و تاز کے لئے اصل جولانگاہ اور ''شاہ بازوں'' کی پرواز کے لئے اصل فضا یہی تھی۔

یہ کیوں ہے؟ اور یہ عام و خاص حلقے اس غلط فہمی اور غلط عملی کیوں مبتلا ہوئے اور کیوں اب تک مبتلا ہیں؟ اگر چہ یہ سوال اور اس کا جواب آج کے ہمارے موضوع سے خارج ہے تاہم

---

(۱) گزشتہ صدیوں میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اور ان کے بعد ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے امیر المومنین سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء نے اس غلطی کی اصلاح کی طرف خاص اور مستقل توجہ فرمائی جیسا کہ ''مکتوبات امام ربانی'' اور ''صراط مستقیم'' کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔

اصل مدعا ہی کو سلجھانے کی خاطر اس بارہ میں اتنا عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک عوام الناس کی غلط فہمی کا تعلق ہے سو اس کی وجہ وجہ تو یہ ہے کہ پہلے طریقہ (قرب بالنوافل) میں چونکہ سالک عوام کی دنیا سے الگ تھلگ رہ کر ہمہ تن عبادت اور ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے اور مشاغل و نیوی میں پھنسے ہوئے عوام اس طرز زندگی کو بے غد مشکل اور انتہائی درجہ کا غیر معمولی کام سمجھتے ہیں اور اس طرح کی مشکل اور غیر معمولی باتوں ہی سے متاثر ہونا اور ان کی خاص اہمیت و وقعت سمجھنا چونکہ عام انسانوں کا مزاج ہے اس لیے یہ بے چارے اسی طریق کو قرب الٰہی اور خدا رسی کا خاص الخاص راستہ سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس طریق پر چلنے والوں سے خوارق و کشوف وغیرہ کا ظہور بھی نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے بھی خیال عام اسی طریق کو خدا رسی کا خاص راستہ اور اسی طرز زندگی کو سب سے بڑا دینی و روحانی کمال سمجھتا ہے۔

رہے اس خیال کے خواص یعنی خود اہل سلوک کے وہ حلقے جو اس غلطی میں مبتلا ہیں اور سلوک الی اللہ کو اسی طریق میں منحصر سمجھتے ہیں۔ سو اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ جن میں سے ایک عمومی اور اس جگہ قابل ذکر وجہ یہ بھی ہے کہ اس طریق (قرب بالنوافل) میں یکسوئی کے ساتھ کثرت ذکر و فکر سے سالک کے باطن میں ایک گونہ لطافت و نورانیت اور ملاء اعلیٰ سے ایک طرح کی خاص مناسبت و موانست پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنے اندر کچھ آثار و انوار محسوس کرنے لگتا ہے اور بسا اوقات ''احوال و کیفیات'' اور ''مشاہدات و تجلیات'' کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے اور دوسرے طریقہ (قرب بالفرائض) میں چونکہ عوام کے ساتھ بھی اختلاط رہتا ہے اور احوال و کیفیات کا ورود اس میں اس طرح سے عموماً نہیں ہوتا۔ یا بہت کم ہوتا ہے۔ بہرحال پہلے ہی طریقہ کے ساتھ بہت سے اہل سلوک کی خصوصی دلچسپی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے۔

حالانکہ یہ ''احوال و کیفیات'' اور ''مشاہدت و تجلیات'' اس فن کے اکابر وائمہ کے نزدیک کوئی خاص مقصدی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ان کا درجہ صرف یہ ہے کہ ان کے ذریعہ مبتدیان راہ سلوک کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ تاکہ شوق و طلب برابر ترقی پذیر رہے اور سعی و جہد کا قدم آگے بڑھتا رہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مشہور خلیفہ ملا یار محمد بدخشی کو ایک مکتوب میں انہی

''مشاہدات وتجلیات'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''شیخ اجل امام ربانی حضرت خواجہ یوسف ہمدانی فرمودہ اند

تلك خیالات تربی بها اطفال الطریقة۔''

''شیخ اجل امام ربانی حضرت خواجہ یوسف ہمدانی نے فرمایا ہے کہ یہ خیالی چیزیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ مکتب طریقت کے بچوں کی تربیت کی جاتی ہے۔''

اور ایک دوسرے مکتوب میں جو ملا حاجی محمد لاہوری کے نام ہے ارقام فرماتے ہیں:

''احوال ومواجید وعلوم ومعارف کہ صوفیا را در اثنائے راہ دست مید ہند نہ از مقاصد اند بل اوہام وخیالات تربیٰ بہا اطفال الطریقۃ (۱) (مکتوب نمبر ۳۶)

''جو احوال ومواجید اور علوم ومعارف صوفیہ پر اثناء سلوک میں وارد ہوتے ہیں وہ مقاصد میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ اوہام وخیالات کے قبیل کی چیزیں ہیں جن کے ذریعہ مکتب طریقت کے بچوں کو تربیت دی جاتی ہے۔''

بہر حال یہ انوار وتجلیات اور یہ احوال وکیفیات جن کا ورود ''قرب بالنوافل'' کے راستہ سے چلنے والے بہت سے سالکوں پر ہوتا ہے اگرچہ وسیلہء تربیت اور ذریعہ ترقی ہونے کی حیثیت سے قابل شکر انعامات الٰہیہ ہیں، تاہم نہ یہ خود مقصود ومطلوب، ہیں اور نہ ایسی دولت، ہیں جس کے لئے ''قرب بالفرائض'' کا راستہ چھوڑ کر ''قرب بالنوافل'' ہی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

حضرت امام ربانیؒ ایک مکتوب میں خاص اپنے متعلق ارقام فرماتے ہیں:

''ایں فقیر از نقد وقت خود می نوید کہ مدتہا از علوم ومعاف واز احوال ومقامات

---

(۱) حضرت مجدد کی ان عبارات کا مطلب یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ''احوال وکیفیات'' اور ''مشاہدات وتجلیات'' شیطانی قسم کے وساوس واوہام ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے (جیسا کہ خود حضرت مجدد ہی نے اسی مکتوب میں آگے چل کر وضاحت فرمائی ہے یہ بھی ایک درجہ میں انعامات الٰہیہ ہیں اور سالک کو ان سے بہت کچھ فائدہ بھی ہوتا ہے بشرطیکہ ان سے ہمت افزائی ہی کا کام لیا جائے اور سالک انہی کو مقصود ومنتہا سمجھ کر ان میں پھنس کر نہ رہ جائے۔

دررنگ ابرنیساں ریختند و کارے کہ باید کرد بعدایت اللہ سبحانہ' کردند ۔ والحال آرزوے نہ ماندہ است الا آں کہ احیائے سنت از سنن مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نمودہ آید واحوال ومواجید ارباب ذوق را مسلم باشد''

(مکتوب ۳۷ جلد ۱)

''یہ فقیر خود اپنی حالت لکھتا ہے کہ مدتوں علوم و معارف اور احوال و مقامات ابرنیساں کی طرح برسے اور ان کا جو نتیجہ نکلنا چاہیے تھا اللہ تعالیٰ کی عنایت سے وہ پورا ہوا اور اب اس کے سوا کوئی ارمان اور آرزو نہیں رہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے کسی سنت کا احیاء کیا جائے اور اس کو رواج دیا جائے اور احوال ومواجید ارباب ذوق کو مبارک ہوں۔''

قرب بالفرائض کی ترجیح وفضیلت کے وجوہ

''قرب بالفرائض'' کے طریقہ اور اس سلسلہ کے مشاغل (مثلاً خدا فراموش انسانوں میں تبلیغ ودعوت، جاہلوں ناواقفوں کی تعلیم وتربیت اور اقامت دین واحیاء شریعت کے لئے جدو جہد وغیرہ) کو ''قرب بالنوافل'' کے طریقہ کے مقابلہ میں ترجیح وفضیلت کی یہ وجہ تو بالکل ظاہر ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے خاص مشاغل ووظائف ہیں۔ اور حضرات انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) خاص انہی کاموں کے لئے مبعوث ہوتے ہیں۔ پس اپنی قوتوں اور اپنی ہمتوں کو انہی کے طریقے پر اخلاص واحتساب کے ساتھ ان کاموں میں لگانا' اور اسی جدوجہد کو اپنا خاص وظیفہء حیات بنالینا ان مقدس وبرگزیدہ ہستیوں کی خاص نیابت بلکہ ایک طرح سے ان کی رفاقت اور ان کے مقصد' ان کی فکر اور ان کے درد میں شرکت ہے اور ایک غیر نبی کے لئے اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں ہوسکتی۔

علاوہ ازیں اس طریقہ کا فیض متعدی ہے کہ اس راہ کا چلنے والا اپنی اصلاح وتکمیل کے ساتھ ساتھ اور سینکڑوں ہزاروں بندگان خدا کی اصلاح وہدایت کا بھی ذریعہ بنتا ہے اور اس واسطے صحیح حدیث......

من دل علی خیر فله مثل اجر فاعله (مسلم)

''جوشخص کسی آدمی کوکسی نیکی کی طرف راہ نمائی کرے تواس شخص کواس نیکی کے
کرنے والے ہی کے برابر الگ ثواب ملے گا۔''

کے مطابق سینکڑوں ہزاروں انسانوں کے بے حساب وشمار اعمال خیر کے بھی اجر کا مستحق ہوتا ہے۔

نیز یہاں یہ بھی نکتہ خاص طور سے ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ ''قرب بالنوافل'' کے طریق میں زیادہ سے زیادہ محنت ومجاہدہ کرنے والے اپنے گنے چنے فرائض کے علاوہ صرف اپنی نفلی عبادات وقربات ہی کا سرمایہ جمع کرسکتے ہیں لیکن ''قرب بالفرائض'' کی راہ پر چلنے والے چونکہ سینکڑوں انسانوں کوان کے بنیادی فرائض کی تبلیغ وتلقین کرتے اورتعلیم دیتے ہیں اس لیے ان کے حساب میں اپنے ذاتی فرائض ونوافل کے علاوہ ان سینکڑوں آدمیوں کے فرائض (اورنوافل) کا بھی اجرلکھا جاتا ہےاور یہ معلوم ومسلم حقیقت ہے کہ فرائض کا اجرنوافل سے بدرجہازیادہ ہے۔ اورنفس ایمان واسلام کا درجہ تویقیناً فرائض ونوافل سب سے زیادہ ہے پس اللہ کا جو بندہ ''قرب بالفرائض'' کی راہ اختیارکرکے خدااوررسول سے بیگانہ اورحقیقت ایمان واسلام سے ناآشناقسم کے جاہلوں اورغافلوں میں تبلیغ کرکےاوران کوتعلیم وتربیت دے کے دین سے آشنا کرتا ہے۔اس میں کیاشبہ ہے کہ اس میں نامہءاعمال میں ان لوگوں کے نفس ایمان واسلام کا اجربھی لکھاجاتا ہے۔ بےشک اللہ کےسواکوئی نہیں، جواس اجر بےحساب کا حساب بھی لگاسکے۔

نیز''قرب بالنوافل'' کےطریق میں صرف اپنی زندگی تک ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے، جہاں موت نے روح کوجسم سے الگ کیااورسلسلہءعمل ختم ہوا، ترقی بھی ختم ہوجاتی ہے، مگر''قرب بالفرائض'' کی راہ میں جب تک اس کے دینی وعلمی فیض کا سلسلہ جاری رہے(خواہ وہ واسطہ درواسطہ کی شکل میں قیامت تک ہی جاری رہے) برابراعمال نامہ میں اندراج ہوتارہتا ہے اوراس کی وجہ سے درجات میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے۔جیسا کہ احادیث صحیح میں اس کی تصریح وارد ہوئی ہے۔

اورقطع نظران تفصیلات سے، سب سے اہم بات وہی ہے جو پہلے عرض کی گئی ہے کہ''قرب بالفرائض'' کا یہ راستہ انبیاءعلیہم السلام اوران کے خواص اصحاب وحواریین کا راستہ ہے۔اوراس کے مشاغل (تعلیم وتعلم، دعوت وتبلیغ، اصلاح وارشاد اوراقامت دین واحیاء

شریعت کی کوشش وغیرہ) ان حضرات کے خاص مشاغل ہیں۔ پس اس طریق کو اختیار کرنے والے اوران کاموں کوسنبھالنے والے بلاشبہ تمام حضرات انبیاءعلیہم السلام کے اورخصوصاً حضرت خاتم الانبیاءصلی اللہ علیہ وسلم کے دینی خلفاء ہیں۔ اگرچہ سیاسی نظام اور سیاسی طاقت والی خلافت ظاہرہ ان کے پاس نہیں ہے۔لیکن اصل امانت نبویؐ کی حفاظت اور تبلیغ ودعوت اور ماننے والوں کی تعلیم وتربیت اور اصلاح وارشاد کا کام بھی بلاشبہ ایک طرح کی خلافت نبوت ہی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ مقصدی اہمیت اس کوزیادہ حاصل ہےاور بروجہ احسن اور وسیع پیمانہ پرانہی مقاصد کی تکمیل کے لئے ’’خلافت ظاہرہ‘‘ مقصود ہوتی ہے۔

> ’’نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی غیر سیاسی خلافت (حضرت شاہ ولی اللہ کی اصطلاح کے مطابق ’خلافت باطنہ‘) اگرایک مرکزاور نظام کے ساتھ ہو تو ’’خلافت ظاہرہ‘‘ تک بھی پہنچادیتی ہے ’’استخلاف فی الارض‘‘اور ’’تمکین دینی‘‘ کاانعام انہی فرائض اور انہی خدمات کی انجام دہی پرمرتب ہوتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہےاور یہی اس کی سنت ازلیہ ہے بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا جاسکتا ہے کہ ’’خلافت نبوت‘‘ کے قیام کا صحیح راستہ صرف یہی ہےاوراس طریقہ اور اس ترتیب کوچھوڑ کر دوسرے طریقوں پرجدوجہد کرنے سے اگرچہ ’’اپنی حکومت‘‘ قائم کی جاسکتی ہےلیکن خلافت نبوت قائم نہیں ہوسکتی۔‘‘ (والتفصیل لایسعہ المقام)

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ورنہ عرض کرنا یہی تھا کہ ’’قرب بالفرائض‘‘ کی شان بہت ارفع واعلیٰ ہےاوراس کے مشاغل،تبلیغ ودعوت،تعلیم وتربیت اصلاح وارشاداوراقامت دین و احیاءشریعت کے لئے جدوجہد وغیرہ کا درجہ اوراجر نفلی عبادات وقربات اور ذکروفکر،ہی میں مشغول ومنہمک رہنے سے یقیناً بہت زیادہ ہے۔خصوصاً اس دور میں تو اس طریقہ اوران مشاغل کی اہمیت اس لیےاور بھی زیادہ ہوگئی ہے کہ یہ زمانہ ہی عوامی تحریکات اور عمومی جمہوری دعوتوں کا ہےاورمختلف مادی اور لادینی تحریکیں بے حد تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی عوام کو اپنی طرف جذب کرتی جارہی ہیں۔ایسے وقت میں بھی اگر دین کی دعوت، دینی تعلیم وتربیت اور اصلاح وارشاد کی جدوجہد وسیع پیمانے پراور عوامی تحریک کے رنگ میں نہیں کی گئی اور اللہ کے وفاداراوراس کی رضا کے طلب گار

بندے خدمت دین کے اس عمومی میدان میں نہ اترے تو دین کی امانت کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

امام ابو اسحاق اسفرائینی کا پرجوش اور ولولہ انگیز پیغام رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ ان کے زمانے میں جب عام مسلمانوں کا دین وایمان بعض خاص گمراہانہ فتنوں کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گیا تو آپ اپنے عہد کے بعض ان اکابر ومشائخ کے پاس پہنچے جو دنیا ومافیہا سے یکسو ہو کر پہاڑوں کے غاروں میں عبادت ومجاہدہ میں مصروف تھے اور کہا (اللہ اکبر کیسے درد سے کہا)......

اکلة الحشیش انتم ھھنا وامة محمد صلی الله علیه وسلم فی الفتن۔

''جنگل کی سوکھی گھاس پر گزر کرنے والو! تم یہاں ہو اور رسول اللہ ﷺ کی امت گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہے''

الغرض یہ کام یعنی مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت اور جاہلوں ناواقفوں کی دینی تعلیم وتربیت اور غافلوں، ناآشناؤں کو تبلیغ ودعوت کا کام اگرچہ ہر وقت اور ہر حال میں بہت بڑا اور بہت اہم کام ہے اور جیسا کہ تفصیل سے اوپر عرض کیا گیا۔ عنداللہ اس کا درجہ بہت اعلیٰ وارفع ہے اور امتیوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کمال اور ترقی کا کوئی مقام نہیں ہے۔ بقول حضرت مجددؒ:

''ہیچ کمالے برتبہ دعوت وتبلیغ نہ رسد۔

فان احب عباد الله الی الله من حبب الله الیٰ عباده وحبب عباد الله الی الله وھو الداعی والمبلغ۔''

(مکتوبات امام ربانی مکتوب ۵۷، ج ۲)

''کوئی کمال دعوت وتبلیغ کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اللہ کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کو اس کے بندوں کا محبوب بنادے اور بندوں کو اللہ کا محبوب بنادے اور وہ داعی اور مبلغ ہوتا ہے۔''

لیکن بالخصوص ایسے زمانے میں کہ چاروں طرف سے مادیت اور لادینیت کے بادل امنڈ رہے ہوں اور دین سے غفلت وجہالت اور خدا فراموشی کی گھٹائیں نہایت تیزی سے دنیا پر چھائے چلی جارہی ہیں۔ سو ایسے وقت میں تو ان کاموں کی قدر وقیمت اللہ کے یہاں بے حساب

بڑھ جاتی ہے۔حضرت مجددؒ ہی نے کیسی اچھی تمثیل میں فرمایا ہے:

''مثلاً سپاہیان در وقت غلبہ دشمناں و استیلاء مخالفاں اگر اندک تر ددمی کنند آں قدر نمایاں می شود و اعتبار مے گردد کہ در وقت امن اضعاف آں در خیز اعتبار نمی آید۔'' (مکتوب نمبر۴۴)

''مثلاً جو سپاہی دشمن کے غلبہ اور مخالفین کے چڑھ آنے کے نازک وقت میں تھوڑی سی بھی وفادارانہ جدوجہد کرتے ہیں وہ ایسا اعتماد اور امتیاز حاصل کر لیتے ہیں کہ عام امن وسکون کے وقت کئی گنا جانفشانی بھی کریں تو وہ اعتماد و اعتبار پیدا نہیں ہوتا۔''

الحاصل ہر زمانہ میں خاص کر ہمارے اس دور میں دینی و روحانی ترقی اور قرب الٰہی ورضائے خداوندی کا سب سے بڑا ذریعہ اور شاہراہ ''قرب بالفرائض'' ہی کا طریقہ ہے اور اس کے مشاغل مثلاً دعوت وتبلیغ' اصلاح وتعلیم اور اقامت دین واحیاء شریعت کے لئے جدوجہد کا درجہ اور اجر یکسوئی کے ساتھ نفلی عبادات اور ذکر ومراقبہ ہی میں منہمک ومشغول رہنے سے بہت زیادہ ہے۔لیکن ''قرب بالفرائض'' کے ان مشاغل کی یہ امتیازی حیثیت اور ''قرب بالنوافل'' کے مقابلہ میں ان کی یہ عظمت اور فوقیت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کاموں میں اشتغال اخلاص واحتساب اور خشیت وانابت کی صفت کے ساتھ ہو، اگر یہ نہیں ہے تو پھر ساری دوڑ دھوپ اور جدوجہد ایک بے روح عامیانہ تحریک یا ایک پیشہ اور حرفہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔(اعاذنا الله من ذٰلك)اور ان اوصاف (اخلاص واحتساب) کے حاصل ہونے کا عام آزمودہ اور عادتی ذریعہ ان اوصاف والوں کی صحبت ورفاقت اور تنہائیوں کے اوقات میں ذکر وفکر کی کثرت ہے۔ ان دونوں چیزوں کے اہتمام کے بغیر اخلاص واحسان جیسی کیفیات کا پیدا ہونا اگرچہ عقلاً ناممکن نہیں لیکن عادتاً دشوار اور اہل تجربہ کی شہادت کے مطابق شاذ ضرور ہے۔

ضروری استدراک

اوپر کی سطروں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ رہے کہ ''قرب بالنوافل'' کے طریقہ کو ہم غلط یا غیر شرعی یا غیر فرضی سمجھتے ہیں، ہرگز نہیں! حاشا ہزار بار حاشا۔ ہماری گزارش کا مدعا تو صرف یہ ہے

کہ ”قرب بالفرائض“ کا راستہ قابل ترجیح اور افضل ہے اور خصوصاً ہمارے اس زمانہ کے حالات اور دینی ضروریات کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے بندے اس طریق کار کو اختیار کریں اور اپنی ہمتوں کو اسی رخ پر لگائیں۔

نیز ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ فی زمانہ ماحول کے عمومی فساد کی وجہ سے اکثر طبیعتوں کی حالت ایسی ہوگئی ہے کہ کچھ مدت یک سوئی کے ساتھ ذکر و فکر کے بغیر ان پر اخلاص و احسان کا رنگ بھی نہیں چڑھتا۔ سو ایسے حضرات کیلئے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ تیاری کے طور پر کچھ دنوں اسی طریق پر چلیں لیکن مطمح نظر دین کی خدمت و نصرت ہی کے مشاغل کو بنائیں۔ اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کا اس سے بہتر مصرف اور کوئی نہیں۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عوامی دعوت و تبلیغ اور عوامی تعلیم و تربیت کا یہ کام جس کی طرف اس مضمون میں میں نے خصوصیت کے ساتھ دعوت دی ہے۔ اس سے ہماری مراد خاص متعارف وعظ گوئی نہیں ہے جس کے لئے علم دین کی ایک خاصی مقدار ضروری ہے بلکہ حقیقت دین سے ناآشنا طبقوں میں دین کا صحیح شعور پیدا کرنا اور کم از کم دین کی بنیادی باتوں کی ان کو تعلیم و تلقین کرنا اور اس درجہ کی عملی اصلاح کی کوشش کرنا اس سلسلہ کا ابتدائی کام ہے جس میں ہر مسلمان اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ نہ کچھ حصہ لے سکتا ہے اور اسی کے ساتھ خود بھی تعلیم و تربیت حاصل کر سکتا ہے۔

اب ہم اس مضمون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں:

عن الحسن مرسلا سئل رسول الله صلى الله عليه و سلم عن رجلين كانا فى بنى اسرائيل احدهما كان عالما يصلى المكتوبة ثم يجلس فيعلم الناس الخير والاٰخر يصوم النهار و يقوم الليل ايهما افضل؟

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فضل هذا العالم الذى يصلى المكتوبة ثم يجلس فيعلم الناس الخير على العابد الذى يصوم النهار ويقوم الليل كفضلى علىٰ ادناكم۔ رواہ الدارمی، (مشکوٰۃ)

’’حضرت حسن بصریؒ سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے بنی اسرائیل کے دوشخصوں کی بابت سوال کیا جن میں سے ایک دین کا جاننے والا تھا۔اس کا طریقہ یہ تھا کہ فرض نماز پڑھتا اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو اچھی باتیں بتاتا اور سکھاتا اور دوسرا ہمیشہ دن کو روزے رکھتا اور رات بھر نوافل پڑھتا (حضورﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص جو فرائض ادا کرتا اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو اچھی باتیں بتاتا اور سکھاتا تھا۔اس قائم اللیل صائم النہار عابد کے مقابلہ میں ایسی فضیلت رکھتا ہے جیسی کہ تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر مجھے فضیلت حاصل ہے۔‘‘

ملحوظ رہے کہ حضورﷺ کے جواب میں جو تمثیل ہے یہ مقدار فضیلت میں نہیں ہے بلکہ فضیلت کی نوعیت میں تمثیل وتشبیہ ہے۔

قومی کردار

(ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم)

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم(متوفی نومبر 1965ء)اقبال اکیڈمی کراچی کے سابق ڈائریکٹر اور کئی اعلیٰ علمی کتابوں کے مصنف تھے۔ تعلیم اور فلسفہ تعلیم کے علاوہ اقبالیات کے ماہر اور شارح تھے۔اسلامک ایجوکیشن کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا جو ان کے بعد چوھدری مظفر حسین مرحوم نکالتے رہے۔ یہ مضمون اسلامک ایجوکیشن ھی کے ایک شمارے سے لیا گیا ھے امید ھے کہ قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گا۔

قومی کردار کے متعلق بامعنی اور تعمیری بحث کرتے وقت ہمیں مندرجہ ذیل سوالوں پر غور کرنا ہوگا۔قوم کی تعریف کیا ہے؟ کردار کے معنی کیا ہیں؟ قومی کردار کیسے تشکیل پاتا ہے؟ وہ کون سے بنیادی عوامل ہیں جو ہمیں ایک قوم بناتے ہیں؟ اور پاکستانی قوم میں اعلیٰ اور بہترین پایہ کے قومی کردار کو کیسے فروغ دیا جاسکتا ہے؟

قوم کیا ہے؟

قوم افراد کے ایسے مجموعہ کا نام ہے جو ایک مشترک نظریہ حیات پر یقین رکھتے ہوں کسی قوم کا نظریہ حیات اس قوم کے مخصوص نفسیاتی اور تعلیمی ماحول کے مطابق مطلوبہ اوصاف یا اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہوتا ہے۔ایک قوم اس لیے قوم ہے کہ وہ قومی انداز میں سوچتی ہے اور اس کی سوچ اس لئے قومی ہوتی ہے کہ اس کے تمام افراد اس نظریہ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔قومی نصب العین یا آئیڈیل کے اجزائے ترکیبی میں نسل، زبان، رنگ ثقافت، تاریخ، عقیدہ و مسلک اور فلسفہ یا

مذہب خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی آئیڈیل میں یہ تمام اجزاء شامل ہوتے ہیں اور کسی میں بعض۔

کردار کے معنے؟

کردار کو ذہن نشین کرنے سے پہلے ہمیں نظریہ حیات کی مزید وضاحت کرنا ہوگی۔ کردار............سب سے پہلے فرد کی زندگی میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنی جبلت اور فطرت کے مطابق کسی نہ کسی نظریہ حیات کو اپنانے پر مجبور ہے جو مندرجہ ذیل پانچ شرائط پوری کرتا ہو۔

1۔ وہ نصب العین دوسرے تمام نظریات سے زیادہ پرکشش اور محبت کے لائق ہو۔

2۔ اس میں اتنی جاذبیت ہو کہ فرد کے جملہ خیالات پر چھا جائے۔ اسے ایک مثالی آورش بنایا جا سکے۔

3۔ یہ آئیڈیل بلند ہو یا پست، دلکش ہو یا قابل نفرت، صحیح ہو یا غلط، مکمل ہو یا نامکمل، عالم گیر ہو یا علاقائی تاہم فرد کے لئے اس میں دلکشی، پسندیدگی اور سچائی کی وہ جملہ خوبیاں موجود ہوں، جو اس کی یا دوسروں کی نظر میں کچھ اہمیت رکھتی ہیں۔

4۔ جو فرد کے لئے ایک ایسے پیمانہ، معیار اور کسوٹی کا کام دے سکے، جس پر صحیح اور غلط، اچھے اور برے، خوبصورت اور بدشکل کو پرکھا جا سکے۔ جو یہ بتا سکے کہ کس چیز کو قبول کیا جائے اور کون سی کو مسترد۔ جس سے یہ پتہ چل سکے کہ کون سی چیز محبت کرنے کے لائق ہے اور کون سی قابل نفرت۔ جو یہ بتا سکے کہ کون کون سے کام کرنے کے ہیں اور کن کن کاموں سے پرہیز بہتر ہے۔

5۔ وہ نظریہ شخصی زندگی پر اس طرح حاوی ہو جائے کہ اس کی تمام سرگرمیاں اسی کے تابع ہو جائیں عادات وخصائل، عقائد واعمال، خیالات وجذبات، مرغوبات ومیلانات، آرزو اور خواہشات غرضیکہ ہر چیز پر اس نصب العین کی گہری چھاپ ہو۔

انہی چیزوں سے شخصی کردار نشو ونما پاتا ہے۔ انسانی کردار فطرتاً ترقی پذیر ہوتا ہے جوں جوں اس کے شعور وآگہی کی سطح بلند ہوتی ہے اور اپنے نظریہ کے مطابق عمل کرتا ہے، اسی حساب سے اس کا کردار ترقی کرتا ہے۔ کردار کی بنیاد چونکہ نظریے پر ہوتی ہے، اس لئے ایک شخص کا نظریہ حیات جس قدر بلند یا پست اچھا یا برا، دلکش یا بھونڈا ہوگا۔ اسی قدر اس کا کردار بلند یا پست، اور

اچھایابراہوگا۔

قومی کردار کیسے ابھرتا ہے؟

چونکہ ایک قوم کے تمام افراد کسی ایک مشترک نظریئے کے قائل اور پیروکار ہوتے ہیں۔اس کی بقا اور ارتقا کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔اس لئے ان کے اندر مشترک عادات و خصائل، میلانات و مرغوبات، عقائد و خیالات، جذبات و محسوسات، امنگ و خواہشات ترقی کر کے کردار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر قوم اپنا جداگانہ کردار رکھتی ہے۔جس کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے۔ جب اس نصب العین پر عملی زندگی کی عمارت تعمیر کی جاتی ہے، تو وہ قومی آئیڈیل بن جاتا ہے، اسی لئے ہر قوم کو ایک نظریاتی گروہ کہتے ہیں۔قومیں یا نظریاتی فرقے نفسیاتی طور پر اسی طرح ترقی کرتے ہیں جس طرح مختلف عناصر حیاتیات کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ جیسے ہر عنصر اپنا منفرد وجود اور خاص خصوصیات رکھتا ہے۔ بعینہ ہر قوم اپنی جداگانہ نظریاتی حیثیت یا کردار رکھتی ہے۔

وہ کون سے فطری عوامل ہیں جو ہمیں ایک قوم بناتے ہیں؟

ہم محض اس لئے ایک الگ قوم نہیں ہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مصنوعی حالات نے ہمیں ایسا بنا دیا ہے، بلکہ اس لئے ایک قوم ہیں کہ بعض قدرتی اسباب اور فطری عوامل ہماری قومیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ مسلمان قوم کی تعمیر کرنے والے یہ عوامل (دوسری قوموں کی طرح) علاقائی زبان، نسل، رنگ، ثقافت یا تاریخ نہیں بلکہ اسلام کے اس زندہ عقیدے پر پختہ یقین ہے۔جس کا بنیادی پتھر خدائے واحد پر ایمان لانا ہے۔

ہمارا وطن پاکستان جغرافیائی لحاظ سے کئی خطوں میں تقسیم ہے۔ان میں سے ہر خطہ اپنی جداگانہ ثقافت تاریخ اور زبان رکھتا ہے۔ایک خطہ (مشرقی پاکستان) دوسرے چار خطوں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اندریں حالات اگر ہر خطہ اپنی علاقائی زبان، تہذیب و ثقافت، تاریخ یا نسل کو اپنی توجہ کا مرکز اور قومی آئیڈیل بنالے تو قومی کردار کی تعمیر کیسے ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر تمام خطے اسلامی نظام حیات کو مشترکہ آئیڈیل کے طور پر اپنالیں تو نہ صرف علاقائی زبان، نسل، تہذیب و ثقافت اور تاریخ و تمدن کے بت پاش پاش ہوجائیں گے بلکہ ملی شعور اور قومی کردار بھی فروغ پا سکے گا۔

پاکستانیوں میں اعلیٰ اور بلند پایہ قومی کردار کیسے فروغ پاسکتا ہے؟

اس سوال کا جواب ہم ''کردار کی تعریف'' کے ضمن میں دے چکے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ قومی کردار ان عادات وخصائل، میلانات ومرغوبات، عقائد وخیالات، جذبات و محسوسات اور امنگ وخواہشات کے مجموعہ کا نام ہے جو کسی قوم کے افراد میں مشترک طور پر پائے جاتے ہوں اور ان کی بنیاد ایک مشترک نصب العین پر ہو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اگر ہم اپنے قومی کردار کی تشکیل اعلیٰ اور بلند ترین پیمانے پر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایک اعلیٰ ترین مقصد حیات اور بلند ترین آورش کو قومی نصب العین بنانا ہوگا۔ ہمیں ایک ایسا مثالی نظریہ اختیار کرنا ہوگا جو ہر لحاظ سے دلکش، جاذب نظر اور درست ہو۔ وہ نظریہ ایک اور صرف ایک ہوسکتا ہے۔ یعنی اسلام کا نظریہ توحید ہم اس سے زیادہ بلند، بہتر، مکمل، سچے اور عالمگیر نظریے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

پس اگر ایک طرف ملک کے جغرافیائی حالات کے تحت اسلامی ضابطہ حیات کو قومی آئیڈیل کے طور پر اپنانا ہماری سیاسی ضرورت ہے تو دوسری طرف اعلےٰ درجے کا قومی کردر پیدا کرنے کے لئے ہماری نفسیاتی ضرورت بھی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری فطرت کے غیر متحکم اصول بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ بلند مرتبہ قومی کردار صرف اسی صورت میں ابھر سکتا ہے جب ہم اعلیٰ ترین اصولوں کو قومی نصب العین بنائیں اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یہ نصب العین صرف اسلام ہوسکتا ہے۔

اسلامی نظریہ حیات کو قومی آئیڈیل بنانے کا اولین تقاضا یہ ہے کہ خدا پر ہمارا غیر متزلزل اور مستحکم یقین ہو۔ یہ اس یقین محکم ہی کا کرشمہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے سے کہیں طاقتور اور با اثر انگریز اور ہندو قوم سے ٹکر لی اور اپنی جدوجہد میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کر کے پاکستان بنالیا۔ اس کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے نظریہ سے جنوں کی حد تک پیار کریں۔ ہماری زندگی کے سیاسی، اخلاقی، عسکری، قانونی، معاشی، تعلیمی اور معاشرتی غرضیکہ تمام شعبوں میں اسے فیصلہ کن طاقت کا مقام حاصل ہو۔ ہم جس قدر جلد یہ قدم اٹھاسکیں۔ ہمارے حق میں اسی قدر بہتر ہے۔

جب ایک آورش یا آئیڈیل کے ساتھ کسی فرد یا قوم میں سچی محبت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے تمام عقائد و نظریات، خیالات و محسوسات، میلانات و مرغوبات، عادات و اطوار، علم و عرفان، ارادے اور طریق کار، امنگ اور خواہشات پر اس آئیڈیل کی گہری چھاپ لگ جاتی ہے۔ گویا ایک نصب العین شخصی یا قومی کردار کی اسی طرح تعمیر کرتا ہے، جس طرح مناسب کاشت اور آبپاشی سے ایک بیج کا دانہ تناور درخت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مناسب تعلیم و تربیت سے ہم قومی آئیڈیل کو قومی کردار میں ڈھال سکتے ہیں ایک بیج سے وہی پودا اگتا ہے جس کی قوت نمو اس بیج میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ہم ایک قومی نصب العین منتخب کر کے اسی نوعیت کا قومی کردار پیدا کر سکتے ہیں، جس کی صلاحیت اس نصب العین میں ہوگی۔ خدا کا تصور اپنی فطرت کے اعتبار سے وہ واحد نظریہ حیات ہے، جس سے بہترین اور اعلیٰ پایہ کا قومی کردار فروغ پا سکتا ہے۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ ہمیں اسلام کے محض مسلمہ اخلاقی اصولوں مثلاً مساوات انسانی آزادی انصاف، صداقت، اخوت، جرات، بردباری اور دیانتداری وغیرہ کو اپنا لینا چاہیے اور نظریہ توحید پر زیادہ زور نہیں دینا چاہیے۔ اس سے قومی کردار کی تشکیل میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ لیکن ایسا کرنا ہمارے لئے عملاً ناممکن ہے کیونکہ مسلمہ عالمگیر اخلاقی اصول نظریہ توحید کی اسی طرح وکالت کرتے ہیں جس طرح کسی درخت کا بیج خاص قسم کے پتوں اور پھولوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص تازہ اور مہکتے ہوئے پھولوں کا شوقین ہے تو اسے خود اپنے باغ میں ان پھولوں کا پودا لگانا اور اس کی نگہداشت کرنی ہوگی ورنہ اسے باسی، پژمردہ اور کاغذی پھولوں پر اکتفا کرنا پڑے گا جس طرح پھول درخت سے ٹوٹنے کے بعد مرجھا جاتے ہیں۔ اسی طرح سچے اور عالمگیر اخلاقی اصول اپنے اصل سرچشمہ توحید سے کٹنے کے بعد مردہ اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم کسی شخص سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ان اخلاقی اصولوں کی پیروی کرے تو پہلے ہمیں یہ تسلی کرنی ہوگی کہ وہ خدا کو آئیڈیل بنائے اور اس آئیڈیل سے سچا اور بھرپور پیار کرے۔ چونکہ سچے اور عالمگیر اخلاقی ضابطوں کا منبع و سرچشمہ نظریہ توحید ہے اس لئے ان پر وہی شخص عمل پیرا ہو سکتا ہے جو اس نظریئے کا قائل اور چاہنے والا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی پسند کے مطابق کسی نہ کسی نظریئے سے محبت کرتا ہے۔ اگر اسے نظریہ توحید پسند نہیں تو لازماً اس سے فروتر کسی دوسرے

نظریے کو اعمال کا مرکز بنائے گا اور اسی کو ایسا معیار مان لے گا جس پر برے اور بھلے، سچے اور جھوٹ، دلکش اور بدنما کو پرکھا جاسکے۔ اسی نظریے کی روشنی میں وہ یہ طے کریگا کہ کس چیز کو قبول کیا جائے اور کس کو مسترد، کس سے محبت کی جائے اور کس سے نفرت، کونسا کام کیا جائے اور کونسا نہیں۔ اگر ایسا شخص زبان سے اخلاقی اصولوں کی پیروی کا دم بھرتا ہے تو سمجھ لو یا تو وہ دانستہ اپنے باطل نظریات کو چھپا رہا ہے یا ان کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔ یعنی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ جس طرح ہم ببول کے درخت سے آم حاصل نہیں کر سکتے، بالکل اسی طرح غلط نظریہ حیات کو اپنا کر اچھے قومی کردار کی توقع نہیں کر سکتے۔

بظاہر برطانیہ، فرانس، اٹلی، امریکہ اور دنیا کے دوسرے غیر کمیونسٹ ممالک میں خدا پر ایمان ایک مسلمہ اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم وہاں خدا کو آئیڈیل کا درجہ حاصل نہیں، ان کا آئیڈیل سیکولر نیشنلزم ہے۔ ان کے نزدیک سیکولر نیشنلزم آئیڈیل کی ان پانچوں شرطوں پر پورا اترتا ہے جو ہم ابتدا میں بیان کر آئے ہیں۔ نظریہ توحید ان کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ انگریز قوم کی اکثریت اگرچہ خدا کو مانتی ہے لیکن عملاً نیشنلزم ان کے نزدیک تمام نظریات سے بالاتر اور پسندیدہ ہے اور نظریہ توحید کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ان کے تمام اعمال وافعال، عقائد ونظریات، اقدار وروایات اور جذبات ومیلانات کا معیار نیشنلزم (جذبہ قومیت) ہے نہ کہ خدا کا تصور۔ اگر کسی معاملے میں دینی تقاضے قومی تقاضوں سے متصادم ہوں تو انگریز قوم بے دھڑک دینی تقاضوں پر قومی تقاضوں کو ترجیح دیتی ہے۔ ایک لادین اور نیشنلزم کی پجاری قوم سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

پاکستان میں متعدد مذاہب کے پیرو موجود ہیں مثلاً مسلمان، عیسائی، ہندو اور پارسی۔ اس لئے ہمیں ریاست کے سرکاری فلسفہ میں توحید اور اس سے وضع کئے گئے ان معروف ومسلمہ اخلاقی اصولوں کو شامل کرنا چاہیے۔ جن کے بارے میں مختلف مذہبوں کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں۔ ایسا کرنا نہ صرف ملکی حالات کا تقاضا ہے بلکہ قرآنی تعلیمات کے عین مطابق۔ چنانچہ اس سلسلے میں قرآن پاک کہتا ہے۔

''اے اہل کتاب! اس اصول کی طرف لوٹ آؤ جو ہمارے اور تمہارے

درمیان قدر مشترک ہے۔یعنی ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور اپنے ہم جنسوں کو اپنا آقا و مالک نہیں مانتے''۔

اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہم سرکاری طور پر ایک ایسے بنیادی اور مشترک اصول کو اپنے نظریہ حیات کی اساس بنالیں گے جو پاکستان کے تمام مذہبی فرقوں کے فلسفہ حیات کا سنگ بنیاد ہے۔اس طرح تمام مذہبی فرقوں کے اہم ترین جذبات...... مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھا کر سارے فرقوں کو ایک متجانس-(Homo Genous) قوم میں ڈھال سکیں گے۔پوری قوم کا ایک مشترک آئیڈیل ہوگا، جسے اپنانے میں ہم مسرت اور فخر محسوس کریں گے۔اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ فرقہ وارانہ اور مذہبی اختلافات پر اس حد تک قابو پالیا جائے گا کہ ہر فرقہ اپنی حد تک انہیں عزیز رکھے۔اس طرح فرقہ وارانہ کشیدگی اور تلخی ختم ہو جائے گی۔اس مشترک فلسفہ حیات کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے فرقوں کو ان کے مذہب کے مطابق عقیدہ اور عمل کی مکمل آزادی دی جا سکے گی۔اس سے ایک طرف ہم غیر مسلم اقلیتوں کے عقائد و عبادات میں مداخلت سے باز رہ سکیں گے، دوسری طرف اس فلسفہ حیات سے انہیں اضافی مدد مہیا کر سکیں گے۔اس سے ملک کے تمام فرقوں (مسلمان، عیسائی، ہندو، پارسی) کے درمیان یگانگت اور ہم آہنگی بڑھے گی تمام فرقے خدا کے ایک کنبے کی مانند رہ سکیں گے۔جس میں مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے کے خلاف نفرت یا بدخواہی کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔سب فرقے ایک مشترک قومی احساس کے تحت اتحاد اور تعاون کی فضا میں کام کر سکیں گے۔

سچے محبّ وطن پاکستانی کی حیثیت سے ہمیں اس بات پر خاص توجہ دینی ہوگی کہ یہاں کا ہر شہری خدا تعالیٰ پر ایمان کو ایک ایسی زندہ اور فعال قوت بنالے جو اس کی سرکاری و غیر سرکاری سرگرمیوں پر غالب ہو۔اس کے لئے ہمیں ایک مخصوص نظام اختیار کرنا ہوگا، جو ہمیں منزل مقصود تک پہنچادے۔

کسی قوم کے اتحاد، سالمیت اور کارکردگی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی واضح مقصد اور نظریہ حیات ہے یا نہیں؟ اگر کوئی نظریہ ہے تو قوم میں اس کے لئے کتنی تڑپ اور لگن موجود ہے؟ یہ نظریہ ان کے قومی مزاج اور روایات کے مطابق ہے یا نہیں؟ اگر جواب

اثبات میں ہے تو آیا اس آئیڈیل میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جو خود بخود لوگوں کے دلوں میں گھر کر جائیں۔ اگر اس میں ایسی خوبیاں موجود نہیں تو بڑے سے بڑا معلم بھی اپنے تعلیمی منصوبوں اور انتظامات کے باوجود لوگوں کے جذبات کو اس حد تک بیدار نہیں کرسکتا کہ لوگ اس نظریے پر فریفتہ ہو جائیں۔ اگر کسی نظریئے میں داخلی اور باطنی خامیاں موجود ہیں تو اس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے ہم پاکستانی اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب ہیں کہ ہمارے پاس ایسا نصب العین موجود ہے جو تمام شرطیں پوری کرتا اور اپنے اندر جملہ خوبیاں رکھتا ہے۔

جو نظریات مصنوعی اور نمائشی طور پر کسی قوم کو عزیز ہوں انہیں خود ہی قوم چیلنج کر دیتی ہے مثلاً بھارت میں وہاں کی اقلیتوں نے انڈین نیشنلزم کے نظریہ کو چیلنج کر دیا ہے خدا کا شکر ہے کہ ہمارا نصب العین ایک حقیقی اور قابل عمل ہے۔ وہ ہمارے مزاج، روایات اور نفسیات سے پوری مطابقت رکھتا۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ اسے دل کی گہرائیوں میں جگہ دیں۔ کمیونسٹوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں انسان کی تمام تر ترقی کے باوجود خدا کا تصور آج بھی اتنا ہی ہر دلعزیز، نیا، تازہ اور جبلت انسانی کے قریب ہے، جتنا پہلے کبھی تھا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بنی نوع انسان کو اس نظریے کی آج جتنی ضرورت ہے شاید ماضی میں کبھی نہ تھی۔

موجودہ دور میں انسانی حالات کا جو مفکرانہ مطالعہ کیا گیا ہے، اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ قومی نصب العین کے طور پر سیکولر نیشنلزم کی بنیادیں متزلزل ہو رہی ہیں اور اس کی جگہ انسان اور کائنات کے مختلف نظریات لے رہے ہیں۔ دنیا کی جدید ترین ترقی یافتہ ریاستیں بھی دراصل نظریاتی ریاستیں ہیں۔ جنہوں نے فرد کی رہنمائی کے لئے بزعم خویش صحیح یا غلط چند اصول بنالئے ہیں۔ ان میں روس اور چین ہی نہیں امریکہ بھی شامل ہے۔ کیونکہ امریکی قوم کے نزدیک جمہوریت نہ صرف ایک بہترین نظام حکومت ہے بلکہ ایک نظام حیات بھی۔ چنانچہ انہوں نے جمہوریت کو قومی آئیڈیل بنالیا ہے۔ بہت سی قومی ریاستیں جو کسی زمانے میں آسمان سیاست پر درخشندہ ستاروں کی طرح چمکتی تھیں، آج روبہ زوال ہیں۔ بعض نئی قومی ریاستیں بھی جو ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہی ہیں اسی صورت حال سے دوچار ہیں اور تیزی سے کمیونزم کی

طرف بڑھ رہی ہیں۔ آج نیشنلزم کی مٹی اس طرح پلید ہو رہی ہے جیسے ماضی میں قبائلی نظام کی ہوئی تھی۔

ارتقا کی تند و تیز لہریں نسل انسانی کو ایک ایسی عالمی ریاست کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی ہیں جس کی اساس انسان اور کائنات کے فلسفہ پر ہوگی۔ ظاہر ہے یہ فلسفہ کمیونزم نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اس بات کو درست تسلیم کرلیں کہ ارتقائی عمل تیزی سے اس نقطۂ عروج تک پہنچنا چاہتا ہے، جہاں پوری دنیا ایک مکمل معاشرے کی شکل اختیار کرے گی۔ تو ہمیں یہ بات بھی لازماً ماننا پڑے گی کہ اس معاشرے کی بنیاد ایک مکمل اور جامع نظریے......خدا کے تصور پر ہوگی۔ انسانی ارتقا جو دراصل نظریاتی ارتقا ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر اہل پاکستان خدا کے تصور کو اپنا قومی آئیڈیل بنالیں تو پاکستان آئندہ وجود میں آنے والی عالمگیر ریاست کا نقطۂ اجتماع اور مستقبل کے مکمل ترین معاشرے کا مرکز ہوگا۔ اس کے علاوہ اپنے قومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان دوسری اقوام کے ساتھ خیر سگالی اور دوستی کے رشتے بھی قائم کر سکے گا۔ دوسری ریاستوں کے ساتھ ایسے دوستانہ تعلقات اسی صورت میں قائم ہو سکتے ہیں جب عالمگیر ریاست کے شہریوں کو پاکستان پر اعتماد ہو۔ دوسری اقوام کے ساتھ اس کا سلوک منصفانہ اور دیانتدارانہ ہو اور عالمی اتحاد قائم کرنے کے لئے خود پاکستان دوسروں کے ساتھ تعاون کرے۔ اگر خدا ترس اور خدا سے محبت کرنے والی قومیں بھی اپنے معاملات میں انصاف پسند، دیانتدار پرامن اور قابل اعتماد ثابت نہ ہوں، تو دوسری قوموں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

میں اس مقالے کو علامہ اقبال اور قائداعظمؒ کے ارشادات سے دو اقتباسات پر ختم کرتا ہوں جنوری ۱۹۳۸ء میں ''سال نو کے پیغام'' میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا ''دنیا بھر کے مفکر اور دانشور حیران و پریشان ہیں کیا جدید تہذیب اور ارتقا کا انجام یہی ہوگا کہ انسان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جائیں اور روئے زمین پر حیات انسانی کا وجود ناممکن ہو جائے۔ یاد رکھو! انسان دنیا میں فقط اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے اور ترقی پا سکتا ہے جب وہ انسانیت کا احترام کرنا سیکھ لے۔ جب تک انسان، انسانیت کا احترام کرنا

نہیں سیکھتا، یہ دنیا خونخوار درندوں کی شکار گاہ بنی رہے گی قوموں کے درمیان
صرف وہی اتحاد پائدار اور قابل اعتماد ہوسکتا ہے۔ جس کی بنیاد برابری پر ہو
جو نسل، قومیت، رنگ اور زبان کے امتیازات سے پاک اور بالاتر ہو
جب تک یہ نام نہاد جمہوریت، یہ منحوس نیشنلزم اور یہ ذلیل ملوکیت فنا نہیں
ہو جاتی اور لوگ اپنے اعمال سے اس یقین کا اظہار نہیں کرتے کہ پوری
دنیا خدا کا کنبہ ہے۔ جب تک دنیا میں نسل، رنگ اور جغرافیائی قومیتوں کے
بت موجود ہیں، انسان ایک خوشحال اور سکون بخش زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا
اخوت مساوات اور آزادی کے دلکش نعرے محض ایک ڈھونگ ہیں۔''

اس طرح جون ۱۹۴۵ء میں ایک تقریر کے دوران قائداعظم نے فرمایا۔

''حصول پاکستان سے ہمارا مقصد محض آزادی حاصل کرنا نہیں بلکہ اس اسلامی نظریہ حیات کو فروغ دینا ہے جو قدرت کی طرف سے ہمیں قیمتی عطیے اور بیش بہا خزانے کی شکل میں ملا ہے۔ امید ہے کہ دوسری قومیں بھی اس سلسلے میں ہم سے تعاون کریں گی۔''

اسلامی نظریہ حیات کے فروغ میں دوسری قومیں اس طرح تعاون کرسکتی ہیں کہ وہ بھی اس نظریے کے اہم ترین جزو یعنی خدا کے تصور اور اس سے ماخوذ عالمگیر اخلاقی اصولوں کو اپنالیں۔ اس لئے صرف یہی نظریہ ہمارے اعلیٰ اور بلند پایہ کردار کی بنیاد بن سکتا ہے۔

قرآن مجید
کی
پانچ بنیادی اصطلاحات

انجینئر مختار حسین فاروقی

بلاشبہ قرآن مجید آخری آسمانی ہدایت ہے اور ہم انسانوں کی رہنمائی اور کامیابی کے لئے اتاری گئی ہے۔ قرآن مجید کو پڑھنا، سمجھنا، عمل کرنا اور اس کو پھیلانا ہر مسلمان پر لازم ہے چاہے وہ قرآن مجید کی صداقت کا صرف زبانی دعویٰ رکھتا ہے یا واقعی اس کتاب، اسکے ماننے والے، اور اسکے Contents پر قلبی طور پر یقین (Conviction) رکھتا ہے کہ وہ برحق ہے

تورات، انجیل اور زبور کے برعکس قرآن مجید ایسی کتاب ہے جو آج تک محفوظ ہے اور اس کے متن (Text) کی کروڑوں کی تعداد میں کاپیاں آج بھی دنیا میں اسی زبان میں موجود ہیں۔ جس زبان میں یہ اترا تھا۔ اور اس قرآن پر ایمان نہ رکھنے والے انصاف پسند لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ وہی کتاب ہے جو اس کتاب کے لانے والے حضرت محمد ﷺ اپنے پیروکاروں کو دے کر گئے ہیں۔

اس کتاب کو سمجھنے کے لئے عربی زبان کی تحصیل بہت ضروری ہے اور اس کے لئے انسان کو بھرپور محنت کرنی چاہیے۔ عربی زبان کی تحصیل کے ساتھ عربی ادب کا پاکیزہ ذوق پھر مجموعہ احادیث پر ایک گہری نظر اور سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ بھی صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے از حد ناگزیر ہے۔

قرآن فہمی کے اس سلسلے میں قرآن مجید کی بنیادی اصطلاحات کی اپنی جگہ بہت زیادہ اہمیت ہے اور پورے قرآن مجید کے تناظر میں کسی اصطلاح کا پورا خاکہ (Concept) جب تک قاری کے ذہن میں واضح نہ ہو مختلف سیاق وسباق میں صحیح مفہوم کو اخذ کر لینا شاید ناممکن ہو جائے۔

اس تحریر کے ذریعے قرآن مجید کی پانچ بنیادی اصطلاحات یا فکری تصورات کی وضاحت سامنے لائی جارہی ہے تا کہ حکمت بالغہ کے قارئین کے لئے فہم قرآن کے حوالے سے درست سمت میں پیش رفت کی رہنمائی ہو سکے۔ ان سطور میں جن پانچ بنیادی اصطلاحات کا تعارف کرایا جارہا ہے وہ یہ ہیں۔

1۔نور 2۔ہدایت 3۔حیات وممات

4۔ارادہ 5۔صلوٰۃ

ان شاء اللہ ان پانچ اصطلاحات کو ترتیب وار قرآنی آیات، احادیث صحیحہ اور سنت......کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ اس کو ہمارے لئے آسان بنائے۔

نور

قرآن مجید میں لفظ ''نور'' مفرد طور پر 33 مرتبہ آیا ہے جبکہ اضافت کے ساتھ 10 مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ نور کے لفظ کے مشتقات قرآن مجید میں زیادہ نہیں ہیں ''منیر'' کا لفظ قرآن پاک میں (6) مرتبہ آیا ہے۔

کتب حدیث میں اس لفظ کے مشتقات ثلاثی مزید کے ابواب میں سے آئے ہیں۔ باب تفعیل سے اسم مفعول ''منوّر'' آیا ہے جو کہ ''المدینة المنورة'' کا جزولاینفک بن گیا ہے

لفظ ''نور'' کے لفظی معنی جو مفردات امام راغب اصفہانی میں ہیں درج ذیل ہیں۔

النورالضوء المنتشر الذی	نور اس پھیلی ہوئی روشنی کو کہا
یعین علی الابصار	جاتا ہے۔جو دیکھنے میں کام آتی ہے
وذلك ضربان	اور یہ۔نور پھر دنیوی بھی ہے
دنیوی و اخروی	اوراخروی بھی

دنیوی نور....نورعقل،نورفطرت،نورقرآن وغیرہ کے ساتھ ساتھ چانداورسورج وغیرہ کی روشنی پر مشتمل ہے۔

اسی معنی میں روشنی سے مراد راستہ دکھانے والی شئی یا جو راستہ دکھا رہا ہے یا جو راستہ

دکھانے کے اسباب پیدا کر رہا ہے یا جس نے راستہ دکھانے کے لئے کسی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور بھیجا ہے یہ سب معنی ثانوی طور پر اس میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

اخروی نور سے مراد وہ روشنی ہے جو پل صراط پر چلنے کے لئے درکار ہوگی۔

لفظ ''نور'' کے مندرجہ بالا استعمالات جو قرآن پاک میں آئے ہیں۔ بظاہر مختلف اور بے ربط نظر آتے ہیں مگر آپ ذرا غور کریں تو محسوس کریں گے کہ ایک ہی حقیقت کے کئی پہلو ہیں جو سیاق وسباق کے مطابق سامنے آ رہے ہیں۔

بطور مثال دیکھیں اردو میں ''طاقت'' کا لفظ عام بول چال میں مستعمل ہے مگر سیاق و سباق اور متکلم کے انداز اور لہجے سے اس کے معنٰی کا تعین مختلف ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک آٹھ، دس سال کے بچے کے لئے طاقت کے معنی اور ہیں۔ ایک جوان (Teenage) کے لئے اور ہیں 25 سال کی عمر کے عورت و مرد کے لئے مختلف اور بڑھاپے میں اس لفظ کا مصداق اور ہے۔ اور یہ سب استعمالات ہم سب جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں اسی طرح لفظ'' نور ''(اور قرآن پاک کی دیگر اصطلاحات) کی تفہیم میں حقیقت ایک ہی ہے فرق صرف سیاق و سباق کی تبدیلی، قاری اور سامع کی ذہنی سطح، علم، تجربہ اور عمر کے ساتھ بدل جاتا ہے دنیاوی کتابوں میں یہ خلا پایا جاتا ہے کہ ایک کتاب جب لکھی جاتی ہے تو خاص عمر، خاص ذہنی سطح اور خاص مضمون پر ہوتی ہے اور وہی اس کو سمجھ پاتے ہیں۔ جبکہ انسان ہوتے ہوئے بھی دوسری سطح اور ذہن اور عمر کے انسان اس کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ معجزہ ہے اور کلام اللہ کی شان یکتائی ہے کہ یہ کلام زمانہ، ماحول عمر اور ظروف و احوال سے بالاتر اور بے نیاز ہو کر نازل ہوا ہے کہ ہر شخص بات کو سمجھتا ہے اور اپنے ظرف (زمانی و مکانی) کے مطابق اس میں سے گوہر مقصود پالیتا ہے۔

انسان ....جس کے لئے یہ کلام الٰہی اتارا گیا ہے اس کی حقیقت تک رسائی کی کوشش کریں اور حقیقتِ انسان کی معرفت حاصل ہو جائے۔ تو اس سے قرآن پاک اور اس کی اصطلاحات کے کئی گوشے بہت واضح اور نمایاں ہو جاتے ہیں اور قاری اطمینان قلبی کی دولت سے

مالا مال ہوجاتا ہے۔ وما ذالك على الله بعزيز

انسان .... ظاہر اور باطن کا مجموعہ ہے اور Appearance کیساتھ ساتھ ایک Reality کا حامل اور مسکن (ٹھہرنے کی جگہ) اور مستقر (ایک مدت تک قیام کی جگہ) ہے

ظاہر .... ہمارا ظاہری حسّی وجود ہے جو مادی ہے اور خاکی الاصل ہے۔ جبکہ باطن .... جو کہ ہمارا اصلی اور حقیقی وجود ہے...... غیر مادی غیر مرئی اور نوری الاصل ہے۔

ظاہر و باطن کا مجموعہ یہ انسان متضاد صفات اور باہمی کشاکش کی حامل صلاحیتوں کا اکھاڑہ (Westling Ring) ہے۔ ہمارا مادی وجود حیوان سے مشابہ ہے اور عناصر ارضی سے اٹھایا گیا ہے اگر چہ اس میں حیوانگی کے لحاظ سے بھی اعلیٰ ترین صفات اور صلاحیتیں ہیں تا ہم بنیادی طور پر کھانا، پینا، آرام، بچوں کی خواہش، پیدائش اور افزائش نسل ہی وجود خاکی کے تقاضے ہیں۔ جبکہ باطنی وجود اور Self یا خودی یا جسے قرآن مجید میں روح کہا گیا ہے۔ وہ قدسی الاصل ہے افلاک سے آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ (قرآن میں '' روحــــی '' کے الفاظ میں) خاص الخاص نسبت رکھتی ہے اس کے ذرائع علم اور خواص اور صلاحیتیں جسمانی وجود سے بہت ہی اعلیٰ اور منفرد ہیں۔ شاید الفاظ کے اشتراک کی وجہ سے ذرا دھوکہ ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں یہ قدسی الاصل وجود ظاہری وجود کے مقابلے میں حقیقی اور اصلی ہونے کے اعتبار سے اتنا اہم اور گوہر گرانمایہ ہے کہ باطنی وجود کی حفاظت اور آب و تاب کے بغیر شاید ظاہری وجود بے معنی ہے۔

انسان کے اب جسمانی اور روحانی تقاضوں کا موازنہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ قرآن پاک میں دو جہانوں کا تذکرہ ہے ایک عالم خلق اور دوسرا عالم امر، عالم خلق میں چیزوں کا بناؤ سنوار ، بگاڑ، بوسیدگی اور موت یعنی وجود کا ختم ہو جانا ناگزیر حقیقت ہے اور وقت کا تصور بھی ایک FOURTH DIMENSION کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ عالم امر میں قدسی وجود کا متشکل ہونا، اعلیٰ مدارج تک اٹھان اور تکمیل و کاملیت کے حصول کا سفر ایسی شانیں ہیں جس میں بوسیدگی، بے راہ روی، آوارگی اور بے مقصدیت کے بعد اختتام کا تذکرہ نہیں ہے۔

آسمان، زمین، سیارے، چرند، پرند، دریا، پہاڑ اور انسانی خاکی وجود عالم خلق میں شمار ہوتا ہے۔ جبکہ عالم امر میں فرشتے، جنت، دوزخ، روح، وحی وغیرہ آتے ہیں۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

ہے ذوقِ تجلی بھی اس خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

یہ روح انسانی اللہ تعالیٰ سے ایک خاص نسبت رکھتی ہے اور نوری وجود ہے جو ہر انسان کو عطا ہوتی ہے اور ایک نور ہے اس روحانی وجود کے اپنے الگ ذرائع علم ہیں جو مادی وجود سے مختلف ہیں۔اسی روح کی وجہ سے انسان میں ایک اخلاقی حسّ (MORALITY) ہے اور انسان نیکی بدی میں تمیز کرتا ہے اسی احساس کو اردو میں ''ضمیر'' اور فطرت انسانی کہا جاتا ہے اسی ضمیر کی اصل حالت میں برقراری کو فطرت سلیم سے موسوم کیا گیا ہے ایک انتہائی شکل میں یہی فطری پاکیزگی انبیاء کرام علیہم السلام کا خاصہ تھا۔عام انسانوں میں سے بھی جو اس فطرت سلیم کی حفاظت میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔وہی مقربینِ رب اصحاب المیمنہ اور اولیاء اللہ اور صالحین شمار ہوتے ہیں۔اس روح پر نور کے لفظ کا اطلاق ہوا ہے اور اسی کی نسبت سے فرشتے بھی نور ہیں۔اس روح کی صحیح اٹھان اور رفعت کے لئے پیغمبر تشریف لائے اور ان کو ''وحی'' اور کتابیں عطا ہوئیں۔ان سب پر بھی لفظ ''نور'' کا اطلاق ہوتا ہے۔اسی طرح روحانی وجود کے ہدایت یافتہ ہونے پر اندرونی اور بیرونی نور کے اجتماع کو ''نور علی نور'' فرمایا گیا ہے۔ہدایت کی سب سے بہترین شکل صراط مستقیم کو پہچان لینا اور اس پر گامزن ہو جانا ہے اسی لئے اس کو بھی ''نور'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تعرف الاشیاء باضدادھا۔یعنی چیزوں کو ان کے متضاد یا ضد سے پہچانا جاتا ہے۔لفظ نور کا متضاد یا ضد ''ظلمت'' ہے۔ظلم کا لفظ سب جانتے ہیں کہ لغت میں ظلم کے معنی وضع الشئی فی غیر محلہ یعنی کسی چیز کو اس کے اصلی اور فطری مقام سے ہٹا دینا یہ ظلم ہے اور چونکہ ایسا ''ظلم'' یعنی چیزوں اور افکار و نظریات یا حقائق کو تہہ و بالا کر دینا انسان بصارت و بصیرت یعنی ''نور'' کی عدم موجودگی میں ہی کر سکتا ہے۔لہٰذا اسی ''ظلم'' سے ''ظلمت'' کا لفظ بنایا گیا ہے بمعنی ''اندھیرا'' اور ظلم اور ظلمت دونوں ہی نور کی ضد ہیں۔ایک حدیث پاک میں ہے۔

ان الظلم ظلمات یوم القیامة (متفق علیہ،عن ابن عمرؓ)

’’بیشک ظلم ہی قیامت کے دن اندھیرے (کا باعث) ہوگا‘‘۔

یہی ظلم دنیا میں بھی ذہنی اورفکری عدم بصیرت کا نتیجہ ہے۔اور نور انہیں ظلمات سے نکالنے کا ذریعہ اور آلہ ہے۔آیئے قرآن مجید سے چند آیات مبارکہ کے حوالہ سے اس لفظ کے استعمالات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات امتحان اور آزمائش کے لئے بنائی ہے۔

فرمایا!

الحمد لله الذی خلق السمٰوٰت و الارض و جعل الظلمات والنور (الانعام۔1)

’’ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیرا اور روشنی بنائی‘‘

ظلمت اور نور کے فرق کو واضح کرنے لئے فرمایا!

قل هل یستوی الاعمٰی والبصیر ام هل تستوی الظلمٰت والنور (رعد-16)

’’پوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہے؟ یا اندھیرا اور اجالا برابر ہوسکتا ہے‘‘؟

اسی طرح فرمایا!

وما یستوی الاعمٰی والبصیر ولا الظلمات ولا النور (فاطر۔20)

’’اور اندھا اور آنکھ والا برابر نہیں اور نہ اندھیرا اور روشنی‘‘

یہ ایک حقیقت ہے کہ ظلمت اور نور اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں انسان کی آزمائش یہ ہے کہ ظلمت کو چھوڑ کر ’’نور‘‘ کا راستہ اختیار کرے قرآن پاک میں ظلمت اور نور کے بارے میں ایک لطیف اشارہ یہ پایا جاتا ہے کہ ظلمت کی جمع ’’ظلمات‘‘ کا استعمال قرآن میں اکثر ہے جبکہ سیدھا راستہ ’’نور‘‘ کا لفظ ہمیشہ واحد کے طور پر آیا ہے۔گویا گمراہی کے پرتو اور SHADES تو

بیشمار ہیں اور انسانوں کی طرح اسکے درجے اور مدارج بھی ان گنت ہیں جبکہ ہدایت ایک ہی ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے محمدﷺ یہ قرآن مجید آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے تا کہ آپ انسانیت کو فکری اور عملی گمراہیوں سے نکال کر روشنی اور ہدایت کی طرف لے کر آئیں۔

الٓر کتاب انزلناه الیك لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور (ابراھیم۔1)

''الر (یہ) ایک (پرنور) کتاب (ہے) اس کو ہم نے تم پر اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ''۔

مزید فرمایا کہ اپنی قوم (اہل عرب) کو بالخصوص متوجہ فرمائیں۔

ان اخرج قومك من الظلمٰت الی النور (ابراھیم۔5)

''کہ اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے جاؤ''

نیز اللہ تعالیٰ بھی یہی چاہتے ہیں اور اپنے مخلص بندوں اور وفاداروں کو اپنے ''نـــور'' کی طرف بڑھاتے رہتے ہیں۔

الله ولی الذین اٰمنوا یخرجهم من الظلٰمت الی النور (بقرہ۔257)

''جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کا دوست خدا ہے کہ اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے''

جبکہ ہر وہ شخص جو مخلوق خدا کو اس راستے سے ہٹا رہا ہے وہ گمراہی پر ہے اور شیطان کی طرح مردود ہے اور طاغوت کا کام کر رہا ہے کہ وہ ''ظلمات'' کی طرف انسانیت کو لیکر چل رہے ہیں

والذین کفروا الیآؤھم الطاغوت یخرجونهم من النور الی الظلمات (بقرہ۔257)

''اور جو کافر ہیں ان کے دوست شیطان ہیں۔ کہ ان کو روشنی سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں''۔

بعینہ یہی بات اللہ تعالیٰ نے توراۃ اور انجیل میں نازل فرمائی تھی۔

انا انزلنا التوراة فیھا ھدی و نور (مائدہ۔44)

’’بے شک ہم نے تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے‘‘۔

اور واتیناہ الانجیل فیه ھدی و نور (مائدہ۔46)

’’اوران کو انجیل عنایت کی جس میں ہدایت اور نور ہے‘‘۔

مزید برآں خالق ارض وسمانے رب العلمین کی حیثیت سے صرف ہماری جسمانی ضروریات کا سامان بہم نہیں پہنچایا بلکہ ہماری روحانی اور اخلاقی ضروریات کا بھی خیال رکھا ہے اور انبیاء کا سلسلہ اور وحی وہدایت عطا فرمائیں تا کہ ہم صراط مستقیم پر گامزن ہوسکیں۔

فرمایا! ھوالذین ینزل علی عبدہ آیٰت بینٰت لیخرجکم من الظلمٰت الی النور و ان اللہ بکم لرء وف رحیم (الحدید۔9)

’’وہی تو ہے جو اپنے بندے پر واضح (المطالب) آئیتیں نازل کرتا ہے تا کہ تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لائے ، بیشک خدا تم پر نہایت شفقت کرنے والا (اور) مہربان ہے‘‘۔

ایک اور انداز میں اللہ تعالیٰ نے یہی بات سمجھائی کہ!

اللہ نورالسمٰوٰت والارض (نور۔35)

’’خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے‘‘۔

اللہ کے نور کا پرتو فطرت انسانی میں روح ربانی کی شکل میں ہے اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اسی لئے خاص اپنی طرف فرمائی ہے لفظ ’’رُوحِی‘‘ میں روح کی نسبت بالخصوص ذات باری تعالیٰ کی طرف واحد متکلم کی ضمیر کی صورت میں آئی ہے جو یقیناً روح کی تفخیم شان کے لئے وارد ہے۔

’’روح‘‘ اک نکتہ نوری ہے یا بقول اقبال خودی ہے اسی کی پاکی اور چمک کے متعلق فرمایا!

یکا دزیتھا یضیء ولو لم تمسسه نار (نور۔35)

’’(ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) اس کا تیل خواہ آگ اسے نہ بھی چھوئے جلنے کو تیار ہے‘‘۔

یہی روح اپنی پاکیزگی اور اخلاص کے اعتبار سے ایک خاص مرتبہ پر ہو تو وحی خداوندی کو پہچانتی ہے اور سعید روحیں وحی کی خوشبو کی تلاش میں سرگرداں ہوتی ہیں اور حضرت ابوبکرؓ اور دیگر سابقون الاولون کی طرح آگے بڑھ کر اسکو سینے سے لگالیتی ہیں۔اسی وجدانی کیفیت کا نام ہے

نورُ علی نور۔(نور۔35)

''روشنی پر روشنی (ہو رہی ہے)''

اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اپنی رحمت کے ذریعے مسلسل نور کی طرف بڑھاتے ہیں۔

هو الذی یصلی علیکم و ملٰئکته لیخر جکم من الظلمٰت الی النور (احزاب۔43)

''وہی تو ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تا کہ تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے''

اللہ تعالیٰ کی ہی شان رحمت ہے جو حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالی نے آفتاب ہدایت بنا کر بھیجا اور قرآن جیسی کتاب عطا فرمائی۔

قد جاء کم من الله نور و کتاب مبین (مائدہ۔15)

''بیشک تمہارے پاس خدا کی طرف سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے''

اور و یخرجهم من الظلمٰت الی النور باذنه (مائدہ۔16)

''اور اپنے حکم سے اندھیرے میں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے''

اور جو لوگ روح کی پاکیزگی کا اہتمام نہیں کرتے طاغوت اور شیطان کے جال میں پھنس جاتے ہیں ان کی روحانی کیفیات ختم ہو کر حیوانوں کی سطح پر آجاتی ہیں اور نورانیت ناپید ہو جاتی ہے۔روح مردہ ہو جائے تو انسان ''زندہ'' ہوتے ہوئے بھی ''موتی'' کے حکم میں ہوتا ہے اور یہ ''نور'' ضائع ہونے پر دوبارہ کہیں سے میسّر نہیں آسکتا۔

و من لم یجعل الله له نورا فما له من نور (نور۔40)

''اور جس کو خدا روشنی نہ دے اس کو (کہیں بھی) روشنی نہیں (مل سکتی)''

مزید برآں جو لوگ راہ حق کی مخالفت کرتے ہیں اور اہل ایمان اور انبیاء کرام

علیہم السلام کا راستہ روکتے ہیں۔ وہ نہ صرف اس سے محروم رہتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے اندر کے ''نور'' بھی ضائع کر لیتے ہیں۔

فلما اضاء ت ماحوله ذهب الله بنور هم و تركهم فى ظلمٰت لا يبصرون (بقرہ۔17)

''جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کیں تو خدا نے ان کی روشنی زائل کر دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کچھ نہیں دیکھتے''

یہ نور اور روشنی روحانی اور فکری اعتبار سے اس طرح ہے جیسے انسان سورج اور چاند کی روشنی سے فائدہ حاصل کر کے راہ دیکھتا اور صحیح سمت کا انتخاب کرتا ہے چنانچہ چاند کی روشنی کو خنک روشنی یعنی نور قرار دیا گیا ہے۔

اسی نور کا ایک پرتو قیامت کے دن ہوگا جب دنیا میں مسلمان شمار ہونے والے سب لوگوں کو ایک راستہ پر گزارا جائے گا (جسے عرف عام میں پل صراط کہتے ہیں) وہاں اہل ایمان کو ایک ایمان کا نور اور دوسرا اعمال صالحہ کا نور عطا کیا جائے گا۔

يوم ترى المومنين والمومنٰت يسعىٰ نور هم بين ايديهم و بايمانهم (حدید۔12)

''جس دن تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھو گے کہ ان (کے ایمان) کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں طرف چل رہا ہوگا''

جبکہ اسی راستے کے آغاز میں منافق (نام نہاد مسلمان) کہیں گے۔

انظروانا نقتبس من نور كم (حدید۔12)

''ہماری طرف نظر شفقت کی جیئے کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کر لیں''

قيل ارجعو ا وراء كم فا لتمسوا نورا (حدید۔13)

''تو ان سے کہا جائے گا کہ پیچھے کو لوٹ جاؤ اور (وہاں) نور تلاش کرو''

جو مسلمان اس دنیا میں غلطیوں اور گناہوں میں ملوث ہونے کے بعد توبہ کر لیں گے اور

زندگی بدل لیں گے فرمایا!

هم الصديقون والشهداء عند ربهم لهم اجرهم و نورهم

(الحدید۔19)

''یہی اپنے پروردگار کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ان کے لئے ان

(کے اعمال) کا صلہ ہوگا اور ان (کے ایمان) کی روشنی''

دورنبوی علی صاحبها الصلوة والسلام میں (بھی اور دجال کے حالیہ فتنہ کے دور میں بھی یہود کے فتنوں کے علی الرغم) جو لوگ نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائیں گے اور ساری سختیاں برداشت کر کے ان کا ساتھ دیں گے ان کے دوہرا اجر اور خصوصی نور ہوگا۔

يوتكم كفلين من رحمته و يجعل لكم نورا تمشون به

ويغفر لكم والله غفور رحيم (حديد 28)

''وہ تمہیں اپنی رحمت سے دگنا اجر عطا فرمائے گا۔اور تمہارے لئے روشنی

کردے گا جس میں چلو گے اور تم کو بخش دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے''

ہمارے جیسے گناہگار اور خطا کار اہل ایمان قیامت کے دن اپنے اعمال کے سبب اس نور میں جب کمی پائیں گے تو بارگاہ رب العزت میں اس طرح عرض گزار ہوں گے (یہ دعا بھی اسی اللہ تعالیٰ نے کمال مہربانی سے سکھائی ہے)

ربنا اتمم لنا نورنا واغفرلنا انك علىٰ كل شئى قدير

(التحريم 8)

''اے پروردگار ہمارا نور ہمارے لئے پورا کر اور ہمیں معاف فرما بے شک

تو ہر چیز پر قادر ہے''

اس نور کی قلب انسانی میں موجودگی کی علامت یہ ہے کہ انسان کا دل اسلام کے لئے کشادہ ہو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر خوش دلی سے عمل پیرا ہو۔غلطی پر معافی مانگے اور وہ دوبارہ راہ راست پر چل کھڑا ہو۔ فرمایا:

افمن شرح الله صدره للاسلام فهو علیٰ نور من ربه
(الزمر 22)

بھلا جس کا سینہ خدا نے اسلام کے لئے کھول دیا ہو اور وہ اپنے پروردگار
کی طرف سے روشنی پر ہو (تو کیا وہ سخت دل کافر کی طرح ہو سکتا ہے)

قرآن مجید میں لفظ ''نور'' کے استعمال اور اس کے مشتقات سے متعلق تحریر کرتے ہوئے اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانی وحی کو بھی ''نور''فرمایا ہے اور اس کی حامل کتابوں کو بھی استعارۃ (اور حقیقتاً بھی ظرف کو مظروف کی وجہ سے)نور فرمایا ہے چنانچہ سابقہ آسمانی کتب، صحائف، زبرالاولین اور قرآن مجید کو بھی نور فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ سابقہ انبیاء کے بارے میں فرمایا!

جاؤا بالبینات والزبر والکتاب المنیر (آل عمران 184)
''بہت سے پیغمبر کھلی ہوئی نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتابیں لیکر آ چکے ہیں''

عمومیت کے انداز میں انبیاء سے کج بحثی کرنے والوں کے بارے میں فرمایا۔

ومن الناس من یجادل فی الله بغیر علم ولاهدی ولا
کتاب منیر (لقمان 20)
''اور بعض لوگ ایسے ہیں کہ خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں نہ علم رکھتے
ہیں اور نہ ہدایت اور نہ کتاب روشن''

اور قرآن پاک کے بارے میں بالخصوص سورۃ اعراف میں اہل ایمان کی شان یوں بیان ہوتی ہے کہ!

فالذین امنوا به وعزروه ونصروه واتبعواالنور الذی انزل
معه اولئك هم المفلحون (اعراف 157)
''جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی رفاقت کی اور انہیں مدد دی۔ اور جو نور
ان کے ساتھ نازل ہوا اس کی پیروی کی وہی مراد پانے والے ہیں''

انبیائے کرام علیہم السلام کی مقدس ہستیاں دنیا میں تشریف لائیں ان کے قوائے عقلیہ

اورحواس روحانی کے کیا کہنے وہ آسمانی ہدایت کے نور کولوگوں میں بانٹتیں رہیں اورراہ یاب کرتی رہیں ان کے اس عمل میں انہوں نے جو کچھ فرمایا اور کہالوگوں کووحی خداوندی کی تشریح فرمائی اس کو اس مناسبت سے ''نور کا پرتو'' ہونے کی وجہ سے نور سے ہی تعبیر فرمایا گیا ہے۔

اومن کان میتاً فاحیناہ وجعلنالہ نورا یمشی بہ فی الناس
(الانعام 122)

''بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کوزندہ کیااوراس کے لئے روشنی کردی
جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے''

گویا۔۔۔۔۔۔روح انسانی، فرشتے، انبیاء کرام، پر نازل کردہ صحیفے، زبر، کتب، وحی، ایمان، اعمال صالحہ، اوروہ اعضا جن سے یہ اعمال صادر ہوتے ہیں اس نور کا محل ہونے کی وجہ سے نور کا مصداق قرار پاتے ہیں۔اوراللہ تعالیٰ ہدایت دینے والا ہے وحی اور کتابیں بھیجنے والا ہے لہٰذاوہ اس نور کا اہتمام کررہا ہے وہ بھی اس نور کا منبع ومصدر ہونے کی بناپر نور ہی ہے۔

قرآن مجید کے بعد احادیث کا درجہ آتا ہے اورقرآن کی تشریح صاحب کتاب حضرت محمد ﷺ کی تشریح کے بغیر ''جان کے بغیر جسم'' کی سی ہے۔چنانچہ کتب حدیث میں ہمارے آقا و امام حضرت محمد ﷺ کی ایک دعا منقول ہے۔جس میں لفظ ''نور'' کثرت سے آیا ہے (12 دفعہ)

اللھم	اے اللہ!
اجعل فی قلبی نوراً	تو میرے دل میں نور پیدا کردے
وفی لسانی نوراً	اور میری زبان میں نور
وفی بصری نوراً	اور میری نگاہ میں نور
وفی سمعی نوراً	اور میرے کانوں میں نور
وعن یمینی نوراً	اور میری دائیں جانب بھی نور
وعن یساری نوراً	اور میری بائیں جانب بھی نور
ومن فوقی نوراً	اور میرے اوپر بھی نور

ومن تحتی نوراً	اور میرے نیچے بھی نور
ومن امامی نوراً	اور میرے آگے بھی نور
ومن خلفی نوراً	اور میرے پیچھے بھی نور
واجعل لی فی نفسی نوراً	اور میری جان میں نور پیدا کردے
واعظم لی نوراً	اور تو مجھے بہت بڑا نور عطا فرمادے

عن ابن عباسؓ (متفق علیه، نسائی، مسند احمد)

یہ دعا فجر کی سنتیں گھر میں ادا کر کے مسجد کو جاتے ہوئے صبح کے دھندلکے میں رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے۔ آپ بھی اپنے معمولات میں شامل کر لیجئے اور اس دعا کی حلاوت کا مزہ اٹھایئے۔

ہماری دعا تو شرف قبول حاصل کرے یا نہ کرے ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی دعا تو ضرور قبول ہوئی ہوگی۔ اور وہ سراپا ہی ''نور'' ہوگئے۔ شاید اسی بات کو ایک اور روایت میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ یوں فرماتی ہیں!

"کان خلقه القرآن"

وہ سراپا قرآن (نور اور ہدایت) تھے۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کی سمجھ عطا فرمائے اور اس کے معانی سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

باقی چار اصطلاحات کی تشریح ایک ایک کر کے
ان شاءاللہ آئندہ شماروں میں آئے گی

تہنیتی خطوط

مکرمی ومحترمی جناب انجینئر مختار فاروقی صاحب زید مجد کم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

مزاج گرامی!

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ کا موقر جریدہ ماہنامہ ''حکمت بالغہ'' ماہ جنوری 07ء کا شمارہ موصول ہوا۔ایک عمدہ علمی، تحقیقی، معلوماتی رسالہ کے اجراء پر مبارک باد قبول فرماویں۔تمام مضامین نہایت پُر معنی اور قابل مطالعہ ہیں۔اللہ کریم آپ کی اس کاوش کو شرف قبول عطا فرماوے۔

تبادلہ میں ماہنامہ ''القاسم'' جاری کردیا ہے۔امید ہے ''حکمت بالغہ'' بھی تبادلہ کی بنیاد پر باقاعدگی سے بھیجا جاتا رہے گا۔ و اجرکم علی اللہ

والسلام

عبدالقیوم حقانی

گرامی قدر انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''حکمت بالغہ'' کا پہلا شمارہ ملا۔خوشی ہوئی۔اس ہدیہ پر شکر گزار ہوں۔سرزمین جھنگ تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں قدآور علمی شخصیات نے جنم لیا اور میدان علم و ادب میں اپنے

گہرے نقوش چھوڑے۔ اگر آپ حکمت بالغہ کو استمرار بخشنے میں کامیاب رہے تو آپ کا یہ عمل جھنگ کی عملی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو شرف قبول عطا کرے۔

ابتداء آسان مگر استمرار مشکل ہوتا ہے۔ آپ کے لئے استقامت کی دعا کرتا ہوں۔ بدعلمی اور بے یقینی کی آندھیوں میں چراغ روشن کرنا اور روشن رکھنا آسان نہیں۔

''شکر واجب ہے'' کے عنوان سے جھنگ میں فکری بیداری، اور شعوری آبیاری کے حوالے سے نئی معلومات حاصل ہوئیں اور یہ خیال مزید پختہ ہوا کہ جھنگ کی مٹی بہت نم بھی ہے اور زرخیز بھی۔ صرف ساقی کی توجہ کی ضرورت ہے۔ لوگ محنت کے لئے بڑے شہروں کا رخ کرتے ہیں جبکہ جھنگ جیسے علاقوں میں کم محنت سے کہیں زیادہ مثبت نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو بارآور کرے۔ اپنی بساط بھر ہر خدمت کے لئے مستعد ہوں اپنے ہم سفر ساتھیوں کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

والسلام

(ڈاکٹر قاری محمد طاہر)

مدیر (ماہنامہ التجوید) فیصل آباد

محترم مختار حسین فاروقی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انسانیت کی سب سے بڑی خدمت اللہ کی گمراہ اور بھٹکی ہوئی مخلوق کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی ہے۔ یہ ایک اہم ترین دینی فریضے اور منصب امامت کی ادائیگی بھی ہے اور اعلیٰ ترین عبادت بھی۔ جو خالق کی طرف سے اپنی بہترین مخلوق کو عطا کی جاتی ہے۔ اور جب اس خدمت کا محور و مرکز ہی قرآن مجید ہو تو پھر یہ نورٌ علیٰ نور کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

کتنے خوش قسمت اور بالا بخت ہیں قرآن اکیڈمی جھنگ کے جناب مختار حسین فاروقی صاحب جو اس نور جبین قرآن کریم کی حیات بخش کرنوں سے تاریک دلوں کو منور کرنے کی اعلیٰ ترین خدمت کیلئے اپنی سوچ، اپنی فکر، اپنی تمام صلاحیتیں، ساری توانائیاں، اپنا تن من دھن سب

کچھ وقف کر چکے ہیں اور اس پیغمبرانہ مشن سے ان کی دیوانگی کی حد تک وابستگی نے اب تو یہاں ایک ضرب المثل کی سی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

اور اب ماہنامہ ''حکمت بالغہ'' کا اجراء اس سمت ایک اور اہم قدم ہے جو یقیناً ان کی زندگی کے اس دشوار اور ہمہ وقتی مشن میں ایک سنگ میل ثابت ہوگا اور بھٹکے ہوئے بے راہ انسانوں کے لئے منارہ نور اور شان منزل بھی! اس مجلّہ کو قرآنی مجلّہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ قرآنی پیغام کا علمبردار ہی تو ہے اور اس کے اجراء کا بنیادی مقصد قرآنی علوم کی ترویج واشاعت اور اس پیغام الٰہی کو بندوں کے دلوں کے اندر اتار کر ان میں اسلامی انداز فکر پیدا کرنا اور قرآن فہمی کی طرف راغب کرنا ہی تو ہے۔ حضرت حکیم الامتؒ کے الفاظ میں ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

اس عنایت ربانی پر میں جناب فاروقی صاحب کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اپنے مرشد ورہبر حضرت ابوانیس محمد برکت علی قدس سرہ العزیز بانی دارالاحسان کا یہ مقالہ۔۔۔ جو یقیناً ان کے لئے تقویت کا باعث ہوگا۔ ان کی نذر کرتا ہوں۔

''ہر عنایت کے ہمراہ پہلے قبولیت اترا کرتی ہے پھر توفیق۔''

خیر اندیش (صدیق صادق)

الصلوٰۃ الوسطیٰ

قرآن مجید میں سیاق کلام اوراحادیث نبویہؐ کی روشنی میں

انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے والا ہر قاری جب اس آیت پر پہنچتا ہے کہ:

حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطی وقوموالله قٰنتین

(البقرۃ:238)

''خبردار رہو سب نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے''۔(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

تو لامحالہ نماز کی محافظت کے ضمن میں ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' کے خصوصی ذکر پر چونک جاتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ کس نماز کی طرف اشارہ ہے۔ عام قاری یقیناً تفاسیر ہی کی طرف رجوع کرتا ہے (یا علماء سے رجوع کرے گا۔ اور بالواسطہ یہ بھی تفاسیر ہی سے رجوع ہے کہ وہ بھی کسی تفسیر زیر مطالعہ سے دیکھ کر یا ذاتی مطالعہ اور ذوق سے ذہن میں موجود مفہوم کو بیان کر دیں گے)۔

تفاسیر میں اس آیت کی تشریح اور الصلوٰۃ الوسطیٰ کے تعین کے بارے میں تقریباً یکساں عبارت اور جملے ملتے ہیں۔ مثلاً تفسیر عثمانی میں ہے:

''بیچ والی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے کہ دن اور رات کے بیچ میں ہے اس کی زیادہ تاکید فرمائی کہ اس وقت دنیا کا مشغلہ زیادہ ہوتا ہے ۔ اور فرمایا! کھڑے رہو ادب سے' یعنی نماز میں ایسی حرکت نہ کرو کہ جس سے معلوم ہو جائے کہ نماز نہیں پڑھتے......''

اسی طرح ضیاء القرآن میں پیر کرم شاہ الازہری فرماتے ہیں:

''درمیانی نماز سے کون سی نماز مراد ہے۔اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں لیکن راجح قول یہ ہے کہ عصر کی نماز ہے۔ حضرات علیؓ ابن مسعود، عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین وغیرہم کا یہی قول ہے۔ اور امام اعظمؒ کا یہی مسلک ہے......''

صاحب تدبر قرآن جناب امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

''والصلٰوۃ الوسطیٰ کے لفظی معنی تو بیچ والی نماز کے ہیں اور اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس خاص سے کیا مراد ہے، تو اس کے جواب میں اہل تاویل نے بڑا اختلاف کیا ہے زیادہ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ ہمارا اپنا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے......''

صاحب تفہیم القرآن مولانا مودودی فرماتے ہیں:

ترجمہ : ''اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو، خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسن صلوٰۃ کی جامع ہو۔ اللہ کے آگے اس طرح کھڑے رہو جیسے فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں''۔

تشریح: اصل میں لفظ ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' استعمال ہوا ہے ۔اس سے بعض مفسرین نے صبح کی نماز مراد لی ہے، ۔بعض نے ظہر، ۔بعض نے مغرب اور

بعض نے عشاء کی۔لیکن ان میں سے کوئی قول بھی نبی ﷺ سے منقول نہیں ہے۔صرف اہل تاویل کا استنباط ہے۔سب سے زیادہ اقوال نماز عصر کے حق میں ہیں......''

معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں:

''کثرت سے علماء کا قول بعض احادیث کی دلیل سے یہ ہے کہ بیچ والی نماز عصر ہے......''

انگریزی تفسیر میں عبداللہ یوسف علی صاحب لکھتے ہیں:

" 271-The Middle Prayer-Salat ul wusta may be translated 'the best or most excellent prayer'---- the weight of authorities seems to be in favour of interpreting this as the Asr prayer-----"

اب تک کی تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ الصلوٰۃ الوسطیٰ سے مراد زیادہ تر عصر کی نماز ہے۔ تاہم مفسرین نے باقی نمازیں بھی اس سے مراد لی ہیں۔زیادہ تر مفسرین نے جنگ احزاب کے دن ہونے والے اس واقعے سے استدلال کیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی نماز عصر فوت ہوئی تو آپؐ نے فرمایا:۔

ملا الله بیوتهم و قبورهم نارا کما شغلو ناعن الصلٰوة الوسطیٰ حتّٰی غابت الشمس ۔(متفق علیہ)

''اللہ تعالیٰ کفار ومشرکین کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے کہ انہوں نے ہم کو بیچ والی نماز سے مصروف رکھ کر روک دیا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا''۔

یہاں لفظ ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' آیا ہے۔اس سے تعین کے ساتھ عصر کی نماز مراد ہے۔اکثر علماء ومفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں بھی اسی حدیث کی روشنی میں الصلوٰۃ الوسطیٰ سے نماز عصر ہی مراد لی ہے۔

زیادہ تر مفسرین کرام نے پھر نماز عصر کے پیش نظر عصر کے وقت کی اہمیت ونزاکت پر بحث کی ہے۔اور جن حضرات نے دوسرے معنی کئے ہیں انہوں نے دوسرے اوقات کی اہمیت اور انسانی طبعی رجحانات کے پیش نظر رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے۔

ان سطور میں اس بات کی ایک طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید میں سیاق کلام، نظم قرآن اور دیگر داخلی شہادتوں کے ساتھ ساتھ عام انسانی جبلی تقاضوں اور رجحانات کی روشنی میں ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' کے معنی کا تعین ہو سکے۔

اس مقصد کے پیش نظر آگے کی گفتگو درج ذیل مباحث پر مشتمل ہوگی:

۱) الفاظ کی لغوی بحث

۲) سیاق کلام میں ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' کی ترکیب کے تقاضے

۳) قرآن حکیم کی دیگر شہادتیں اور احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ سے اقتباس

۴) حاصل کلام

اب آیئے اسی ترتیب سے گفتگو کرتے ہوئے مدعا تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔
آیت زیر مطالعہ میں محافظت 'الصلوٰۃ الوسطیٰ اور قنوت کے الفاظ اہمیت کے حامل ہیں۔لفظ محافظت باب مفاعلہ ہے حفظ سے اور قرآن حکیم میں اس فعل کے ثلاثی مجرد اور مزید فیہ میں کئی مشتقات استعمال ہوئے ہیں۔ثلاثی مجرد میں حافظ اور حافظون بہت زور دار معنی میں استعمال ہوئے۔جیسے فرمایا گیا!

اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنَّاله' لَحفِظُونَ (الحجر۔9)

''بے شک ہم نے اتاری ہے آپ پر یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں''۔

اسی طرح سورۃ توبہ آیت 112 میں اہل ایمان کی مختلف شانیں بیان فرمانے کے بعداللہ تعالیٰ فرماتے ہیں!

وَالحٰفِظُونَ لِحُدُودِ اللّٰہ۔

''اوروہ حفاظت کرنے والے ہیں ان حدود کی جواللہ نے باندھی ہیں''۔

حفظ' حافظ' حافظون اورحافظات کے الفاظ کسی معین شے کی حفاظت اوراس میں کسی قسم کی دخل اندازی اوررخنہ اندازی کے علاوہ MISUSE سے بھی بچانے کا زوردار داعیہ رکھنے کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں جیسے!

وَالَّذِینَ ھُم لِفُرُوجِھِم حٰفِظُونَ (المومنون)

''اوروہ اہل ایمان اپنی شرمگاہوں کوتھامتے ہیں''۔

جبکہ باب مفاعلہ میں مُحافظة سے حَافِظ اور حَافِظُوا امر کے صیغے ہیں۔اس میں ایک تو مقاتلہ کی طرح کسی دوسرے فریق یا داعیے کے خلاف مقابلہ کرکے حفاظت کرنے کا مفہوم ہے' اور یہ علیٰ کے اضافے کے ساتھ استعمال ہوا ہے جس کے معنی بار بار ایسا کرنے کے ہیں۔دیگر ابواب سے بھی یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ہم اس سے اس وقت صرف نظر کررہے ہیں۔

الصلوٰۃ الوسطیٰ۔لفظ صلوٰۃ تو بالاتفاق نماز کے معنی میں ہے اور آیت میں آگے لفظ ''قُومُوا'' اور قنوت سے یہ بات مئوکد ہوتی ہے کہ یہ نماز کے لئے ہی آیا ہے۔الوسطیٰ: وسط' اوسط سے مئونث وسطیٰ۔اس کے معنی بہترین بھی لئے گئے ہیں اور سامنے کی اور بیچ کی چیز کے بھی بیچ کی چیز یا آڑے آنے والی چیز زیادہ قرین قیاس ہے جنگ احزاب کے دن والے واقعے میں یہی ہوا کہ کفارو معاندین سے مسلمانوں کا مقابلہ جاری تھا اور ہمہ وقت مستعدی اور VIGILIANCE کے نتیجے میں نماز کا وقت آیا اور نکل گیا۔اس کیفیت میں یہ امکان بھی ہے کہ نماز کے وقت کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔لہٰذا الصلوٰۃ الوسطیٰ وہ نماز ہوگی جو کسی شدید مشغولیت میں ہونے پر سرے سے بھول جائے یا یاد ہونے کے باوجود بالارادہ یا غیرارادی طور رآدمی ادا نہ کرے یا اس مشغولیت سے نکل کر ادا کرلی جائے۔مثلاً آج کے کاروباری حضرات کے لئے ظہر' عصر'

مغرب، عشاء، سب الصلوٰۃ الوسطیٰ کے ضمن میں ہونگی۔

لفظ قنوت کا معنیٰ ہے ’’لزوم الطاعة مع الخضوع ‘‘ یعنی اللہ کی اطاعت لازم پکڑنا عاجزی کے ساتھ۔ قُومُوا کا اضافہ کر کے ہر مشغولیت سے اٹھ کھڑے ہونے کا مفہوم سامنے لایا گیا ہے۔

آیت زیر مطالعہ سورۃ بقرہ میں جس مقام پر واقع ہوئی ہے وہ قرآن مجید میں عائلی قوانین ___ نکاح و طلاق کے معاملات کی سب سے طویل اور مفصل بحث کا تکمیلی اور CONCLUDING حصہ ہے۔

گویا بندۂ مومن یا مومن بندی (مرد ہو یا عورت) کے لئے ایک گھریلو زندگی میں جہاں ان احکام کی پیروی ضروری ہے اور ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جن کا تذکرہ ان چار رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے، وہیں اس آیت میں درج ہدایات کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ ان رکوعوں میں عورت و مرد یا میاں بیوی کے درمیان بعض پابندیوں کا ذکر ہے، پھر علیحدگی کی شکل میں طلاق کی تفصیل اور بچوں کے معاملے میں رضاعت کا ذکر ہے۔ مہر کی ادائیگی وغیرہ جیسے امور پر بحث کی گئی ہے جو گھر کے ادارے میں میاں بیوی کے درمیان ناموافقت کی صورت میں پیش آ سکتے ہیں۔

دوسری صورت وہ ہے کہ میاں بیوی میں حد درجہ محبت و موافقت کے نتیجے میں دوسری انتہائی صورت پیدا ہو جائے کہ اللہ کے احکام کی وقعت کم ہونے لگے اور نماز جیسی عبادت، جو ہر روز پانچ مرتبہ وقت کے تعین کے ساتھ فرض ہے، کی اہمیت نگاہوں میں نہ رہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اس پہلو پر بڑے لطیف اور بلیغ انداز میں توجہ دلائی گئی ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ توجہ ادھر بھی رہنی چاہئے۔ گویا متاہل زندگی میں مومن مرد اور مومن عورت کے درمیان جو تعلقات استوار ہوں اور محبت و مودت کا جو رشتہ قائم ہو وہ دینی فرائض اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے فریم کے اندر اندر ہی رہنا چاہئے۔

آیت زیر مطالعہ میں نماز کی محافظت کے ضمن میں پہلے عمومی موانع اور مشکلات سے متنبہ رہنے اور چوکنا رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور پھر عام سے خاص کی طرف توجہ دلانے کے لئے خصوصی طور پر ان نمازوں کی محافظت پر زور دیا گیا ہے جو بندۂ مومن کی گھریلو زندگی اور مصروفیات

کے دوران آتی ہیں اوران نمازوں کے راستے میں جورکاوٹیں آئیں (یعنی بیویوں سے محبت اور ان کی دلجوئی، اولاد کے ساتھ وقت گزارنا اور گھریلومصروفیات وغیرہ) ان کوفوراً بھانپ لینے اوران سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

الصلوٰۃ الوسطیٰ کے مزید تعین اوراس کے اہم ترین درجے کے پہنچاننے میں قرآن فہمی کے دوسرے اصول سے کام لیں تو مزید انشراح صدر حاصل ہوگا اور حکمت قرآنی کے کئی مزید گوشے سامنے آئیں گے۔ وہ اصول ہے۔ ''اَلقُرآنُ یُفَسِّرُ بَعضُہ' بَعضاً ''یعنی ایک ہی مضمون کا قرآن حکیم میں ایک سے زیادہ بار ذکر ہوتو گویا ایک حصہ دوسرے حصے کی مبہم تفاصیل کو واضح کردے گا۔

گھریلو زندگی سے متعلق سورۂ نور میں ستر کے احکام (گھر کے اندر کا پردہ) کا ذکر ہے اور آیت 58 میں فرمایا گیا ہے!

یٰاَیُّھَاالَّذِینَ اٰمَنُوا لِیَستَاذِنکُمُ الَّذِینَ مَلَکَت اَیمَانُکُم وَالَّذِینَ لَم یَبلُغُوا الحُلمَ مِنکُم ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ط مِن قَبلِ صَلٰوۃِ الفَجرِ وَحِینَ تَضَعُونَ ثِیَابَکُم مَن الظَّھِیرَۃِ وَمِن بَعدِ صَلٰوۃِ العِشَآءِ ط ثَلٰثُ عَورٰتٍ لَّکُم ط لَیسَ عَلَیکُم وَلَا عَلَیھِم جُنَاحُ بَعدَ ھُنَّ ط طَوّٰفُونَ عَلَیکُم بَعضُکُم عَلیٰ بَعضٍ ط کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الاٰیٰتِ وَاللّٰہُ عَلِیمُ حَکِیمُ ۔

''اے ایمان والو! اجازت لے کرآئیں تم سے جوتمہارے ہاتھ کے مال ہیں (لونڈی یاغلام) اور جوکہ نہیں پہنچے تم میں عقل (بلوغ) کی حدکوتین بار فجر کی نماز سے پہلے اور جب تم اتاررکھتے ہواپنے کپڑے دوپہر میں اورعشاء کی نماز کے پیچھے یہ تین وقت ہیں بدن کھلنے کے تمہارے (اور گویا کہ دوسروں سے چھپنے کے) کچھ تنگی نہیں تم پر نہ ان پر ان وقتوں کے پیچھے (علاوہ) پھراہی کرتے ہیں ایک دوسرے کے پاس۔ یوں کھولتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے آگے باتیں، اوراللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔''

بندۂ مومن کی نجی زندگی میں، چاہے شادی شدہ عورت ہو یا شادی شدہ مرد، یہ اوقات قربت کے ممکنہ مواقع کے ہو سکتے ہیں اور ایسے موقع پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا موسم کی مناسبت (سردی یا گرمی)، گھریلو حالات (جائنٹ فیملی یا علیحدہ رہائش)، غسل کے انتظامات (اٹیچڈ باتھ یا دیگر مشترکہ سہولت) اور طبعی کسل مندی کے علاوہ اضافی طور پر شیطان اور نفس کی وسوسہ اندازی کی وجہ سے غسل کو عام طور پر DELAY کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

اوپر درج آیت میں اگرچہ ایسے مواقع تو تین ذکر کئے گئے ہیں تاہم عملاً اس کی سرحد پر دو ہی نمازیں واقع ہوتی ہیں، رات کو فجر اور ظہر کے بعد نماز عصر۔ فلہٰذا۔۔۔۔ اس آیت کی رو سے شادی شدہ زندگی میں الصلوٰۃ الوسطیٰ نماز عصر ہے یا نماز فجر۔ اور بندۂ مومن کو ان ہر دو میں سے جو نماز بھی آڑے آ رہی ہو اس کا اہتمام کرنے اور نفس کے مرغوبات سے علیحدہ ہو کر اللہ کی عبادت کیلئے مرد اور عورت کو عاجزی سے کھڑے ہو جانے کا حکم دیا گیا ہے۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ گھر گرہستی کی زندگی میں الصلوٰۃ الوسطیٰ نماز فجر یا نماز عصر ہے۔ اور اس کی بر وقت ادائیگی عام طور پر دشوار ہو جاتی ہے اور عملی طور پر بھی ان نمازوں کے بارے میں گھروں میں شدید کوتاہی پائی جاتی ہے۔ نئے شادی شدہ جوڑے تو کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہی ہیں، ادھیڑ عمر کے مسلمان بھی ان نمازوں کی بر وقت ادائیگی میں ناکام رہتے ہیں۔ یہ کوتاہی شوہروں میں بھی بہت ہے تاہم بیویوں میں زیادہ ہے اور عام طور پر اکثر عورتیں اس طرح کی نماز فجر یا نماز عصر کو قضا کر دیتی ہیں۔

اس تقصیر میں یقیناً اگر شوہر کی قوامیت، جبر و قہر اور ہر قیمت پر اپنی خواہش کو پورا کرنے کا جذبہ کارفرما ہو تو اس گناہ کا زیادہ بوجھ بھی اسی کے حصے میں آئے گا۔ اور اگر بیوی کی کسل مندی اور طبعی سستی کو دخل ہے تو اس کے لئے نمازوں کو قضا کرنا آخرت میں وبال جان بنے گا۔

میانہ روی اور اعتدال کا تقاضا یہ ہے کہ والدین بھی اولاد کی شادی اور رخصتی کے موقع پر نمازوں کی بر وقت ادائیگی کی تلقین کریں اور شوہروں کو بھی ہر قیمت پر اپنے جذبات کی تسکین کی بجائے مصالحانہ، مشفقانہ اور معتدل رویہ اپنانا چاہئے تا کہ میاں بیوی دونوں اس دنیا میں بھی

پرسکون زندگی بسر کرسکیں اور آخرت میں رضاءِ الٰہی کا حصول ممکن ہو جائے۔ گویا الصلوٰۃ الوسطیٰ کا التزام اور محافظت بہت ضروری ہے اس کی اہمیت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے اور اوپر سورۃ نور کی آیت کے حوالے سے جن تین مواقع کا ذکر ہے ان تخلیہ کے لمحات کو بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پیروی کر کے تقربِ خداوندی کا ذریعہ بنانا چاہیئے جو کہ ذرا سی محنت اور توجہ سے ممکن ہو سکتا ہے یہ کام ذرا مشکل ضرور ہو گا ناممکن نہیں ہے۔

آیت زیرِ مطالعہ میں آغاز میں عمومی محافظت صلوٰۃ کا تذکرہ ہے اور پھر خاص کی طرف توجہ کو مبذول کرایا گیا ہے۔ اس انداز میں اگر استدلال کو منطقی طور پر مزید آگے بڑھایا جائے تو اہل دل اور اہل ذوق کے لئے ایک اور لطیف اشارہ بھی ملتا ہے۔

نماز فجر رات کے لمحات تخلیہ میں آڑے آتی ہے اور نماز عصر دن کے ظہیرہ (قیلولہ) کے لمحات میں اللہ کی یاد دلاتی ہے۔ یہاں ذرا رُک کر غور کریں اور ایمان کے درجات کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھیں تو حکمت کا ایک اور دروازہ کھل جاتا ہے۔

حقیقی ایمان کے درجات بے شمار ہیں۔ تاہم سورۃ واقعہ میں مقربین کو سب سے اعلیٰ درجہ پر فائز بتایا گیا ہے۔ اسی طرح محسنین کو دیکھیں یا صادق الایمان کی اصطلاح کیحقیقت پر نظر کریں، عاشقانِ ذات الٰہی کا گروہ ہو یا عاشقانِ رسولؐ ہوں' مومن کامل کہہ لیں یا مرد مومن' بات اتنی سی ہے کہ اس درجے کے اہل ایمان کے نزدیک پانچ فرض نمازوں کے علاوہ تہجد کا اہتمام بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور لسانِ رسالت ﷺ سے اس کی فضلیت پر بہت سی صحیح حدیثیں کتب احادیث میں وارد ہیں۔''

جناب حضرت محمد ﷺ کے لئے تو نماز تہجد کی اہمیت بہت ہی زیادہ تھی تاہم آپ کے امتیوں میں سے بھی جس جس کا ایمان ایک خاص درجہ تک ترقی کرتا ہے اس کے لئے نماز تہجد کا التزام اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

فلٰهذا__ عموم سے خاص کی طرف استدلال کا تقاضا یہ ہے کہ نماز فجر و عصر میں سے نماز فجر سے رات کے تخلیہ کے کنارے پر نماز تہجد سمجھی جائے' یعنی ایمان کے اعلیٰ درجات کا تقاضا یہ

ہے کہ متاہل زندگی میں میاں اور بیوی دونوں کے لئے نماز فجر کا اہتمام تو ہونا ہی چاہئے بلکہ نماز تہجد کو بھی کما حقھا اہمیت دیتے ہوئے اس کو بھی الصلوٰۃ الوسطیٰ سمجھ کر ہوشیار ہوجانا چاہئے اور اس کا بھی اہتمام ضروری ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ تو اس نماز کا شایان شان اہتمام فرماتے ہی تھے جو انہی کے مقام بلند کی مناسبت سے تھا' تاہم آپ نے عام اہل ایمان کے لئے ترغیب و تشویق کے انداز میں اس کے اہتمام کا حکم فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ آپ نے کسی مؤمن میاں بیوی (بالخصوص جوان) کی مثال دے کر ایک حدیث میں دعا دیتے ہوئے مقام مدح میں فرمایا کہ اگر مرد تہجد کے لئے اٹھے تو بیوی کو جگائے اور سستی کرنے پر بے تکلفی کی وجہ سے اسکے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے' اور اگر بیوی اٹھ جائے تو وہ شوہر کو جگائے اور سستی پر اسی طرح اسکے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالے تاکہ نیند سے بیدار ہو جائے اور دونوں اللہ کے حضور عبادت میں لگ جائیں۔ (وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِينَ)۔

جناب نبی اکرم ﷺ تو تہجد کا بھی بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے۔ اور اس کی کیفیت پر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات شاہد ہیں' تاہم آپ منفرد شان کے مالک تھے تو آپ کے معاملات میں بھی انفرادی شان پائی جاتی ہے اور اس کا CLIMAX اور ذروۂ سنام ایک روایت ہے جو اگرچہ بعض وجوہات کی بنا پر ہم یہاں نقل نہیں کر رہے تاہم اس کو تفصیل ابن کثیر میں علامہ ابن کثیرؒ نے سورۃ ال عمران کے آخری رکوع کی آیات 190 اور 195 کی تفسیر میں تین اصحابؓ کے سوال پر کہ آنحضرت ﷺ کی کون سی ادا سب سے عجیب تھی' حضرت عائشہؓ کی روایت سے درج کیا ہے' وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ :-

- ☆ قرآن مجید میں نمازوں کی حفاظت کا عمومی حکم بھی ہے۔ اور اہل ایمان کی شان یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ اپنی نمازوں کی مطلقاً حفاظت کرتے ہیں۔ اور حدیث میں وقت پر نماز کی ادائیگی کو افضل نماز کہا گیا ہے۔ (سورۃ المومنون' سورۃ المعارج)
- ☆ آیت زیر مطالعہ میں امر کے صیغے کے ساتھ گھریلو اور متاہل زندگی کے پس منظر میں اہل ایمان کو نمازوں کی محافظت کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا یہاں خصوصی مرغوبات اور

نفس کی پسندیدہ چیزوں کے علی الرغم نمازوں کی پابندی اور اہتمام کا اشارہ ہے۔

☆ عام سے خاص کی طرف سلسلہ کلام میں الصلوٰۃ الوسطیٰ کہہ کر گھریلو زندگی میں ہر نماز اور مومن مرد اور عورت (میاں بیوی) کے رات کے تنہائی کے لمحات کے بعد نماز فجر اور دوپہر کے قیلولہ کے بعد نماز عصر کے خصوصی اہتمام کا حکم ہے۔

☆ مزید گہرائی میں جائیں تو حکمت قرآنی اور حکمت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا یہ خزانہ بھی سامنے آتا ہے۔ کہ اس مقام پر مومن شوہر اور مومن بیوی کیلئے نماز تہجد کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ لہٰذا پہلے درجے اور اعلیٰ ترین مقام بندگی پر فائز اہل ایمان کے لئے الصلوٰۃ الوسطیٰ نماز تہجد بھی ہوسکتی ہے۔ اگرچہ ہمارے لئے یہ فرض نہیں تاہم اس کی فضیلت اپنی جگہ پر ہے۔

گویا_____ مفسرین کے اقوال کے مطابق الصلوٰۃ الوسطیٰ تو ان ہی پانچ نمازوں میں سے ہی کوئی قرار پائی اور نماز فجر اور نماز عصر پر زور استدلال ہے، تاہم مندرجہ بالا صفحات میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کے قرائن اور احادیث اور سنت نبویؐ سے اس کو مدلل کر کے پیش کیا جائے تاکہ ہر قاری نہ صرف نتیجہ تک پہنچ سکے بلکہ اس کے ساتھ استدلال کی کڑیاں خود ملانے پر اس کو ایک درجے میں اطمینان قلب بھی میسر ہو تاکہ وہ یکسوئی اور بھرپور جذبہ عمل کے ساتھ اس چیز کے حصول میں لگ جائے جس ذوق وشوق اور لگن کا یہ آیت تقاضا کرتی ہے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ راقم نے اگرچہ اپنی امکانی حد تک کوشش کی ہے کہ الصلوٰۃ الوسطیٰ کے مفہوم کو واضح کر سکے، تاہم اگر کہیں غلطی اور استدلال کی کجی نظر آئے تو ضرور مطلع فرمائیں تاکہ اس کو درست کیا جاسکے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات واحادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔